کلیاتِ نشورؔ واحدی

حصّہ غزلیات

مرتبین

نیاز واحدی (مرحوم)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

کلیاتِ نشورؔ واحدی

حصّہ غزلیات

مرتبین

نیاز واحدی (مرحوم)
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

نام کتاب	:	کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات
ایڈیشن	:	باراوّل
مصنف	:	نشورؔ واحدی
مرتبین	:	نیاز واحدی مرحوم، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
ناشر	:	ادبی دائرہ، رحمت نگر عقب آواس وکاس کالونی اعظم گڑھ
سن اشاعت	:	۲۰۱۶ء
کمپوزنگ	:	نورالحسن، یونک کمپیوٹر سینٹر، ندوہ روڈ لکھنؤ
طباعت	:	اصیلہ پرنٹرز دہلی
قیمت	:	Rs: 500/-

ملنے کے پتے

۱۔ادبی دائرہ، رحمت نگر عقب آواس وکاس کالونی اعظم گڑھ
۲۔دانش محل امین آباد چوک لکھنؤ
۳۔رہبر فاؤنڈیشن خالص پور اعظم گڑھ

عرض حال

نیاز واحدی مرحوم علامہ نشور واحدی کے صحیح معنوں میں خلف الصدق تھے۔ انہوں نے نشور صاحب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام کلام کو انتہائی دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا۔ نثری تحریریں اور کتابیں بھی بڑے اہتمام سے شائع کیں اور کئی مجموعہ کلام کے دو۔دو ایڈیشن شائع کئے، یہی نہیں ان پر عمدہ اور معلوماتی دیباچے اور پیش لفظ لکھے اور بہت سے لوگوں سے نشور صاحب پر مضامین و مقالات لکھوائے۔ غرض نشور صاحب کو ایک بار پھر ادبی دنیا میں زندہ کر دیا۔

چند سال پہلے پروفیسر احمر لاری صاحب مرحوم کے مشورہ سے کلیات نشور کا منصوبہ بنا جو تین حصوں حصہ غزلیات، منظومات اور نثر پر مشتمل تھا۔ بعد میں ایک اور حصہ نشور واحدی نقادوں کی نظر میں بھی مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ اول الذکر دونوں کلیات کی ترتیب و تدوین کا کام نیاز واحدی مرحوم نے اپنے ذمہ لیا اور آخر الذکر دونوں حصوں کے لئے راقم کا انتخاب کیا اور ان کے پاس اس سلسلہ میں جو کچھ مواد جمع تھا وہ میرے پاس بھیج دیا اور لوگوں سے مقالات حاصل کرتے رہے۔ میں نے بھی کچھ لوگوں سے مقالات لکھوائے ابھی یہ کام چل ہی رہا تھا کہ پروفیسر احمر لاری صاحب چل بسے اور چند ہی ماہ بعد نیاز صاحب کو آنکھوں میں تکلیف پیدا ہوئی اور وہ اس کے علاج کے سلسلے میں بھاگ دوڑ میں گر پڑے اور کولہے کی ہڈی گئی، کئی مہینے صاحب فراش رہے اور پھر اس بیماری میں وہ جاں بر نہ ہو سکے اور ۱۹/مئی ۲۰۱۱ء کو وفات پا گئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

ان کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ حصہ غزلیات بڑی حد تک مکمل ہو چکا ہے اور نیاز صاحب نے عرض مرتب بھی لکھ دیا ہے بس ایک آنچ کی کسر باقی ہے۔ ڈاکٹر محمد ارشد خاں جن کے خانوادہ نشور سے گہرے مراسم ہیں اور جنہوں نے نشور صاحب پر نہایت عمدہ پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے کسی طرح سے حصہ غزلیات کی فائل حاصل کر لائے اور میرے

حوالہ کیا کہ اسے از سر نو دیکھ لیں اور اللہ نے توفیق دی تو اسے شائع کر دیا جائے گا تا کہ نیاز واحدی کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہو جائے۔ اللہ کا شکر ہے اب یہ حصہ ہر طرح سے مکمل ہے اور اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
اعظم گڑھ

۲۳/اپریل ۲۰۱۶ء

انتساب

ڈاکٹر محمد ارشد خاں

کے نام

جن کی کتاب نشور واحدی حیات اور کارنامے
نشور شناسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

عرضِ مرتّب

بڑی مسرّت ہے کہ مَیں ''کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات'' کا پہلا ایڈیشن قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کلیات میں نشورؔ واحدی صاحب کے سات مجموعۂ کلام جس میں غزلیں ہیں، وہ سب کلیات میں شامل کی گئی ہیں، جن کی کل تعداد ۳۱۷ ہیں۔ ان غزلوں کے علاوہ اس میں ۶۲ متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ اس کلیات کو شائع کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اردو ادب کے شائقین، ناقدین، محققین و ریسرچ اسکالرس اور عام قاری کو نشورؔ واحدی کی ساری غزلیں ایک ہی جلد میں پڑھنے کو مل جائیں گی اور ان کے کلام کا جائزہ لینے اور پرکھنے کا موقع میسر ہو سکے گا اور اس سے نشورؔ شناسی کے کام کو مزید وسعت دینے میں مدد مل سکے گی۔

کلیات نشورؔ واحدی کو شائع کرنے کا خیال مجھے پہلے نہیں آیا اور میں نشورؔ واحدی کے مختلف مجموعۂ کلام کو دوبارہ شائع کرنے میں ہی لگا رہا۔ جناب پروفیسر احمر لاری گورکھپور یونیورسٹی نے نہ صرف مجھے کلیات شائع کرنے کی طرف متوجہ کیا بلکہ اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی بھی کر دی۔ جس کے مطابق انشاءاللہ ''کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ نظمیات'' اور پھر ''کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ نثری نگارشات'' طبع ہوگی جس کی کمپوزنگ بھی شروع ہو چکی ہے۔

''کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات'' کے لیے میں نے جناب ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے نشورؔ واحدی پر ایک مضمون لکھنے کی درخواست کی تھی۔ جناب شمس الرحمٰن اپنی مصروفیات اور کمزور صحت کی بنا پر نشورؔ صاحب پر کوئی نیا مضمون لکھنے کے لیے اپنے کو تیار نہ کر سکے اور انھوں نے الٰہ آباد میں ۱۹۹۵ء میں کسی سیمینار کے لیے نشورؔ واحدی اور مسعود اختر جمال پر اپنے تحریر کردہ مقالہ پر نظرِ ثانی اور کچھ اضافہ کر کے مجھے مرحمت فرمایا جو اس کلیات کی زینت ہے۔ اسی طرح میں نے جناب پروفیسر شارب ردولوی صاحب سے کلیات کے لیے پیش لفظ اور جناب ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی آنریری فیلو شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ سے بھی مقدمہ

لکھنے کی فرمائش کی۔ ان حضرات نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود مضامین سپردِ قلم کر کے میری ہمت افزائی فرمائی۔ میں ان سبھی حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ اس کلیات میں بحیثیت مرتب راقم الحروف (نیاز واحدی) کا ایک مضمون ''نشورؔ واحدی اور ان کی تخلیقات'' بھی شامل ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان مضامین اور نشورؔ واحدی کے کلام کو پڑھ کر قارئین خود نشورؔ واحدی کی اہمیت اور اردو ادب میں ان کے مقام کو محسوس کر سکیں گے۔

کلیات کو طبع کرنے کے سلسلے میں جناب شفاعت علی صدیقی ادیب و صحافی اور شہرۂ آفاق اردو پروڈیوسر لکھنؤ ریڈیو (سبکدوش) نے شروع سے لے کر اس کتاب کے طبع ہونے کی آخری منزل تک قدم قدم پر میری رہبری کی اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے، جس کے لیے ان کا بے حد ممنون ہوں۔

اس سلسلے میں مَیں ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شارب ردولوی، جناب احمر لاری، جناب پروفیسر رفیع اللہ خاں مہاتما گاندھی ودیاپیٹھ وارانسی یوپی، جناب ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، جناب ڈاکٹر تحریر انجم ٹاؤن پوسٹ گریجویٹ کالج بلیا، یوپی، جناب ڈاکٹر محمد ارشد خاں، خالص پور اعظم گڑھ، جناب محمد الیٰسین الٰہی ریسرچ اسکالر، جناب سید محمد نور الحسن و جناب سید معراج الحسن یونک کمپیوٹر سینٹر ندوہ روڈ، لکھنؤ اور جناب فیصل وقار، ایس۔ ایف۔ گرافکس، کچہری روڈ، امین آباد، لکھنؤ اور جناب قاضی جنید صاحب صدر القاضی کانپور اور جناب خورشید الرحمٰن حنفی جنرل سکریٹری القاضی کانپور کا بھی ممنون ہوں جو مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔

مجھے یقین ہے کہ ''کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات'' بھی عام و خاص کو اپنی طرف متوجہ کرے گی اور ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ نشورؔ واحدی کے اس شعر سے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

تاباں ہے نشورؔ اپنا تخیّل تو کروں کیا
پردہ مہ و انجم پہ گرائے نہ بنے ہے

نیاز واحدی

۲۹ رمئی ۲۰۱۰ء
408/3 نیو حیدرآباد، لکھنؤ

فہرست مضامین

کلیاتِ نشورؔ واحدی
حصّہ غزلیات

مجموعۂ کلام ''صہبائے ہند''

کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات

مجموعۂ کلام آتش و نم

مجموعۂ کلام فروغِ جام

غزلیں کچھ اور رنگ کی

مجموعہ کلام ''سوادِ منزل'' کچھ نئی مشہور غزلیں

مجموعۂ کلام ’’گل افشانیِ گفتار‘‘

مجموعۂ کلام ''اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک''

پروفیسر شارب ردولوی

پیش لفظ

نشورؔ واحدی اردو کے ان شعراء میں ہیں جنھوں نے اپنی غزلوں کے ذریعہ اردو شاعری کے وقار میں اضافہ کیا۔نشورؔ واحدی کا عہد اردو شاعری کا ایسا روشن عہد تھا جسے قدیم و جدید آوازوں کے امتزاج کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ جہاں ایک طرف اصغرؔ، فانیؔ، آرزوؔ، سیمابؔ اور ثاقبؔ کی آوازیں فضا پر چھائی ہوئی تھیں، دوسری طرف فراقؔ، جگرؔ، اثرؔ اور جوشؔ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اسی زمانے میں ایک تیسری آواز اپنے نئے لب و لہجے اور اظہار و اسلوب کے نئے پن کی وجہ سے عوامی قبولیت کی سند حاصل کر رہی تھی جس میں فیضؔ، مجروحؔ، ساحرؔ، معین احسن جذبیؔ، نشورؔ واحدی اور خمارؔ بارہ بنکوی کی آوازیں نمایاں تھیں۔ فکری اور لسانی اعتبار سے یہ تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ اردو کی شعری روایت تصنع آمیز رومانیت سے نکل کر عشق و محبت کے اظہار میں بھی حقیقت سے آنکھیں چار کرنے پر آمادہ تھی۔ زبان اور رعایتوں سے لطف اندوزی کے باوجود زندگی، نئے تجربات اور اظہار و بیان کے نئے اسلوب کی تلاش میں تھی۔ جگرؔ کی پرکشش شاعری اور دلکش آواز کی حکمرانی کے باوجود جن لوگوں نے اردو غزل میں اپنی انفرادیت اور اظہار و خیال کی تازگی کا لوہا منوایا ان میں ایک بہت نمایاں نام نشورؔ واحدی کا ہے۔

نشورؔ واحدی نے اردو کی شعری روایت سے کوئی انحراف نہیں کیا۔ ان کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے تھا جو اپنی علمی اور دینی فکر کی وجہ سے مشہور تھا اور اسی ماحول میں نشورؔ واحدی کی ذہنی پرورش ہوئی تھی اس لیے ان کے دل میں اُن روایات کا احترام تھا لیکن وہ ایک کشادہ دل و نظر رکھتے تھے۔ ان کے یہاں نئی چیزوں کو دیکھنے، سمجھنے اور قبول کرنے کی گنجائش تھی۔ اسی لیے ان کی شاعری اپنے کلاسیکی پس منظر کے باوجود فکر و اظہار کے معاملے میں نئی تھی۔

نشورؔ واحدی ایک خوش فکر اور خوش گلو شاعر تھے۔ جس وقت وہ مشاعروں میں غزل پڑھتے تھے تو محفل پر چھا جاتے تھے۔ اس زمانے میں کئی شعراء اپنے ترنم کی وجہ سے مقبول تھے لیکن نشورؔ واحدی کی شاعری صرف 'صوت و آہنگ' کی شاعری نہیں تھی۔ ان کے یہاں ایک فکری گہرائی تھی جو اپنی غنائیت کے باوجود اہلِ علم کو سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ اپنی سادہ بیانی کے باوجود ان کے یہاں معنوی تہہ داری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولیت صرف مشاعروں کی مقبولیت نہیں تھی۔ مترنم شعراء اپنی غزلیں چھپوانے سے گریز کرتے تھے، اس لیے کہ انھیں بار بار وہی غزلیں پڑھنی ہوتی تھیں۔ نشورؔ واحدی ہر موقع پر نئی غزل پیش کرنے کے عادی تھے۔ فرمائشوں کے دور کی بات الگ تھی۔ ان کے عہد کے دوسرے شعرا کے اتنے مجموعے نہیں شائع ہوئے جتنے نشورؔ واحدی کے شائع ہوئے۔ ان کے کل مجموعوں کی تعداد تقریباً دس ہے۔ جس میں سات مجموعے ایسے ہیں جن میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ اپنے عہد کے ان گنے چنے لوگوں میں ہیں جن کی شہرت کا مدار صرف شاعری پر نہیں ہے۔ وہ فلسفہ اور تصوّف پر گہری نظر رکھتے تھے۔ دانشِ آخرالزماں، تصوّف و طریقت پر ان کی گرفت کی بہت عمدہ مثال ہے۔ اس میں انھوں نے تصوّف و طریقت کے نکات کو جس طرح واضح کیا ہے ان سے ان کی علمی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسی طرح فلسفۂ خودی اردو شعراء کے یہاں کسی نہ کسی طرح حوالہ بنتا رہا ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں تو باقاعدہ فلسفہ کی شکل میں ہی اس کا ذکر ہے انھوں نے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یا

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

کہہ کر اسے آسمان پر پہنچا دیا۔ نشورؔ واحدی کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس

موضوع پر دو بہت اہم کتابیں لکھیں، تاریخ فلسفۂ خودی (۱۹۷۹ء) اور ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء (۱۹۹۳ء) ان کی یہ کتابیں اردو میں اپنی نوعیت کی بے حد اہم کتابیں ہیں۔

نشورؔ واحدی کی شاعری میں ان کی علمی بصیرت اور فکری گہرائی کی مثالیں جا بجا بکھری ہوئی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ انھوں نے فلسفہ کو زندگی اور فکر کا حصّہ بنالیا تھا۔ اس لیے جگہ جگہ پر ان کے اشعار دامن پکڑ لیتے ہیں، مثلاً ان کا ایک سادہ سا شعر دیکھیے۔

پتّہ پتّہ کا نہیں گلشنِ عالم میں جواب
ذرّہ ذرّہ میں دھڑکتا ہے دلِ یکتائی

ایک قافیے سے ایسی معنوی گہرائی پیدا کرنا نشورؔ واحدی ہی کا حصّہ ہے۔ نشورؔ کے یہاں غزل 'حیاتِ دو عالم' کا نام ہے۔ غزل کے روایتی موضوعات کو وہ ایک بہانہ سمجھتے ہیں۔

نشورؔ اب غزل ہے حیاتِ دو عالم
یہ عنوانِ زلف و کمر اِک بہانہ

یہی وجہ ہے کہ نشورؔ واحدی کی غزل کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اگر ذرا توجہ سے ان کا کلام دیکھیے تو تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کا ہر عکس بڑے خوبصورت انداز میں نظر آئے گا۔ وہ حسن اور غنائیت کے پردے میں اس طرح بات کر جاتے ہیں کہ سننے والا تڑپ جاتا ہے۔ ان کے یہ چند اشعار دیکھیے اور ذرا دیر ٹھہر کر ان کی معنوی تہہ داری اور فکری زاویے پر غور کیجیے۔

یہاں سجدہ وہاں سجدہ معاذ اللہ دیوانہ
نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بت خانہ

اسی طرح کا ایک شعر اور دیکھیے اس میں، 'دیرِ مغاں' کا استعارہ خاص طور پر توجہ کا مستحق ہے۔

میری دنیا میں نہ کعبہ ہے نہ بت خانہ نشورؔ
دل کے گوشے میں مگر دیرِ مغاں رکھتا ہوں

....

حقیقت جس جگہ ہوتی ہے تابانی بتاتی ہے
کوئی پردے میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے

ان کی ایک ہی غزل کے تین اشعار اُسی ترتیب سے پیش کر رہا ہوں تا کہ ان کے یہاں خیال کے ارتقاء کو غزل میں محسوس کیا جاسکے۔ غزل بے ترتیب خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لیے کلیم الدین احمد نے اسے ''نیم وحشی صنفِ سخن'' قرار دیا، لیکن غزل میں بھی خیال کا ایک ارتقاء ہوتا ہے جسے نشورؔ واحدی کی غزلوں میں بہت نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

اس بزمِ محبت میں آ کر بیٹھے تھے کہ محفل ختم ہوئی
دل کے نہ فسانے سن پائے غم کی نہ کہانی کہہ پائے
یوں عہدِ جوانی بیت گیا اور یادِ جوانی دل میں رہی
جیسے کوئی جائے چھوڑ کے گھر اور دیپک جلتا رہ جائے
آغوشِ مسرت میں جینا مشروط ہے غم میں مرنے پر
جو سو نہ سکے وہ کیا جاگے جو کھو نہ سکے وہ کیا پائے

نشورؔ واحدی کے عہد اور ان کی شاعری پر ایک نگاہ ڈالیے تو محسوس ہوگا کہ نشورؔ اس غزل کی تابانی کے عہد میں اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ان کی فکری بصیرت کے چراغ روشن ہیں۔ اُس عہد کے غنائی شعراء کی 'بھیڑ' میں ان کے کلام کی طرف وہ توجہ نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ ان کا ایک شعر خود ان کی شاعری کی تفسیر ہے۔

انقلابات و عزائم کے سنورنے کے لیے
ایک آئینہ پسِ لفظ و بیاں رکھتا ہوں

مجھے یقین ہے کہ اس 'آئینے' کو اگر اُس وقت نہیں دیکھا گیا تو آج کا عہد ان کے اس کلیات میں اُسے دیکھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

پروفیسر شارب ردولوی
گول گیٹ سی ۹۵، سیکٹر ای
علی گنج، لکھنؤ
۱۴؍ مارچ ۲۰۱۰ء

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مقدمہ

جن ادباء وشعراء اور اربابِ کمال نے اردو شعر وادب کو آبروبخشی ان میں ایک نمایاں نام مولانا نشورؔ واحدی مرحوم (۱۹۱۲ء۔۱۹۸۳ء) کا بھی ہے، وہ ایک عبقری اور یگانہ عصر شاعر تھے۔ ان کا مذاق شعر وادب فطری اور وہبی تھا۔ دورِ طفولیت ہی میں موزوں طبعی کے جوہر نمایاں ہوئے، بیس بائیس سال کی عمر میں باقاعدہ طبع آزمائی کا آغاز ہوا۔ پھر دمِ واپسیں تک وہ صہبائے شعر وسخن سے مخمور وسرشار رہے۔

ان کی تعلیم مدارس میں ہوئی، وہ سند یافتہ عالم اور علوم مشرقیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ مذہبی افکار وخیالات پر گہری نگاہ اور مشرقی فکر وفلسفے پر باریک نظر تھی۔ بالخصوص عربی وفارسی زبان وادب پر دستگاہ کامل رکھتے تھے، قدیم ادبی ذخیرے سے واقفیت اور شعرِ عجم کی اداشناسی نے ان کی شاعری کو استحکام بخشا، ان کا جمالیاتی شعور بھی اسی مشرقی اندازِ نظر کا آئینہ دار ہے۔

نشورؔ صاحب نے پہلے مدارس میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا پھر کالج میں استاذ ادب رہے۔ ان سے متعدد افراد واشخاص نے استفادہ اور اصلاحِ سخن کی لیکن خود انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ خود ہی کہا اور خود ہی اصلاح کی، اس سے ان کی بالغ نظری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی پہلی تخلیقی کاوش ''صہبائے ہند'' ۱۹۳۹ء میں منظر عام پر آئی جو ایک مفکرانہ کوشش تھی۔ اس میں نشورؔ صاحب مفکر شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے، اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو جامِ رومی سے لبریز یہ مثنوی فکرِ اقبالؔ کی توسیع تھی۔

ہے کمال زندگی تکمیل کردار و صفات
بے صفاتِ کاملہ ناقص ہے خود روحِ حیات

بے صفات کاملہ یکساں ہے انساں اور خاک
بے صفاتِ کاملہ مہمل ہے عشقِ دردناک
ہے صفت کے ارتقا سے ملّتوں کا ارتقاء
ہے صفت ہی کے تنزل سے تنزل قوم کا

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں:

جذب وحدت آتش عقل و نظر دانش گداز
عشق ظالم عقل خیز و عقل ریز و عقل ساز
جذب وحدت بے وساطت بے رسالت بے پیام
عشق ظالم پر توسل پر تعلق پر کلام
جذب وحدت بے نیاز رہنما منزل بدست
عشق ظالم راہ گیر و راہ جو، رہبر پرست
جب نگاہ جلوہ توحید حاصل ہوگئی
عبدیت بے واسطہ خالق سے واصل ہوگئی

''صہبائے ہند'' ان کی پہلی کاوش تھی۔ اس سے ان کی اٹھان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد متعدد منظوم ومنثور تخلیقات نے ان کی شاعرانہ عظمت، انفرادیت اور بلند پائیگی کا لافانی نقش قائم کیا، شورِ نشورؔ (۱۹۴۲ء) آتش ونم (۱۹۴۶ء) فروغِ جام (۱۹۵۷ء) دانشِ آخر الزماں (۱۹۶۶ء) سوادِ منزل (۱۹۶۸ء) گل افشانئ گفتار (۱۹۷۷ء) تاریخ فلسفۂ خودی (۱۹۷۹ء) اشک چکاں سے سے عصرِ رواں تک (۲۰۰۰ء) وغیرہ، اقلیم شعر وادب پر ان کی کشور کشائی کے ایسے نمونے ہیں جو انھیں بقائے دوام کی دولت عطا کرتے ہیں۔

ان کی نثری کاوشیں دانش آخرالزماں (۱۹۶۶ء) تاریخ فلسفۂ خودی (۱۹۷۹ء) ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء (۱۹۹۲ء) اور رمزِ معانی (۲۰۰۸ء) نہ صرف ان کے گہرے ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ شعور اور وسیع النظری کا نمونہ ہیں، بلکہ اپنے موضوع پر معرکہ آرا

تصانیف بھی ہیں۔ان کے تنقیدی مضامین جو انھوں نے شعر و ادب کے مختلف موضوعات اور شعری مجموعوں پر بطور تقدیم و تبصرہ لکھے وہ قدیم مشرقی طرزِ تنقید کا نمونہ ہیں، راقم کا خیال ہے کہ مشرقی ادب پاروں اور تخلیقات کے تجزیئے کے لیے یہی قدیم اسلوب و انداز تنقید ضروری ہے ورنہ لا طائل قیاسات اور دور از کار تصورات سے حقیقت تک رسائی ناممکن ہو جائے گی اور یہی ہمارے جدید تنقیدی ذخیرے کی بنیادی کمی بھی ہے کہ مغربی نقطۂ نظر کو اہمیت دی گئی، مشرقی اندازِ تنقید کو وسعت دینے کے بجائے اس سے اغماض برتا گیا اور مغرب کی خشک وادیوں سے پیدا رموز تنقید سے شگفتگی کے اظہار نے متعدد مشرقی تخلیقات کا چہرہ مسخ کر دیا۔ بہر حال نشورؔ صاحب قدیم مشرقی روایات کے دلدادہ و شیدا تھے۔انھوں نے جو نثری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ اپنی متنوع خصوصیات کی وجہ سے اس درجہ بلند ہے کہ اس کا ذکر اہتمام سے کیا جائے، خاص طور سے ان کا دلکش اسلوبِ نگارش اور شستہ و شگفتہ نثر ان کے رچے ہوئے تاریخی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں، علم الکلام اور فلسفیانہ افکار و خیالات پر شبلی کے بعد خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ، ورنہ نشورؔ واحدی کے مقام و مرتبہ کی تعیین اور ان کے افکار و نظریات کی تفہیم میں اہلِ علم کو دشواری نہیں ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ نشورؔ صاحب نثر کے میدان میں بھی بلند رتبہ تھے۔ان کی نثری کاوشوں کے پس منظر میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ نثر کی طرف مائل ہوتے اور فلسفۂ خودی کی تاریخ کے بجائے ادبی تنقیدی تحریریں ان کے قلم سے نکلتیں تو اس میں بھی انھیں وہی امتیازات حاصل ہوتے جو ان کی شاعری نے انھیں عطا کیے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ قدرت نے انھیں شعر و شاعری کا مثالی نمونہ بنا کر پیدا کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ نشورؔ واحدی کی ''گل افشانی گفتار'' مثالی قرار پائی اور ان کے ''عزم محکم'' نے ''سوادِ منزل'' تک پہنچایا اور یہی وہ منزل ہے جہاں واحدی صاحب اشکِ چکاں کے بعد پہنچے اور ان کے ممتاز معاصرین نہ پہنچ سکے۔

واحدی صاحب کا عہد نظم نگاری کا عہد ہے، ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاری نے جو رخ اختیار کیا وہ قابلِ تحسین ہو یا نہ ہو لیکن یہ تو ضرور ہوا کہ نظم کا سفر تیز گام، ہم جہت اور ہمہ گیر ہوا۔واحدی صاحب کی بعض نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نظم جدید کی تیز گامی اور

ہمہ جہتی سے بخوبی واقف تھے، تاہم شعوری طور پر انھوں نے اپنی راہ الگ بنائی تھی اور ان کی نظمیں و غزلیں دبستانِ شبلی کے آرگن ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوتیں دراصل وہ اسی دبستان کے نقطۂ نظر کی ترجمان تھیں، خود واحدی صاحب اسی دبستان سے نظریاتی ہم آہنگی رکھتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی اور اقبال احمد سہیل ان کے بڑے مداح و قدرداں تھے۔سید صاحب ان کی تخلیقات شورِ نشور کے عنوان سے ماہنامہ معارف میں نہایت اہتمام سے شائع کرتے تھے۔غرض نشورؔ صاحب نے نظم نگاری میں بھی انفرادیت قائم کی، بطور نمونہ ایک بند ملاحظہ ہو:

میں تکبیر لا الٰہ سے نظام ہستی کو توڑتا ہوں
میں اپنی محشر نوا اذانوں سے خواب ہستی کو توڑتا ہوں
میں تیغ رحمت کی لالہ کاری سے تنگ دستی کو توڑتا ہوں
میں زر پرستی، وطن پرستی، شکم پرستی کو توڑتا ہوں
مری رگوں میں تمام عالم کے باغیوں کا لہو رواں ہے

شبلی جدید نظم کے بانیوں میں ہیں۔اقبال سہیل نے اپنی نظموں سے اس روایت کو نہ صرف استحکام بخشا بلکہ اسے بڑی ترقی دی، یہاں تک کہ وہ دبستان شبلی کے گل سر سبد قرار پائے، جگرؔ اور اصغرؔ نے ان سے فیض پایا تھا، جگرؔ تو مرزا احسان احمد ہی کی دریافت تھے، یحییٰ اعظمی اور حبیب احمد صدیقی وغیرہ اس دبستان کے اہم نظم نگار تھے یہ اور بعض دوسرے شعراء نے بھی ان کی ہم نوائی کی، نشورؔ صاحب کی نظمیں دراصل اسی مکتبہ فکر کی ترجمان ہیں اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے اس دور کی نظم نگاری میں ممتاز مقام کی حامل ہیں۔

نظم نگاری میں یہ ان کی مہارت ہی کی مثال ہے کہ جہاں انھوں نے مناظرِ قدرت اور قدرت کی صناعیوں کو وقت کے دھاروں اور نظامِ فکر کو نظم کا قالب عطا کیا وہیں ''پھولوں کی انجمن'' بھی سجائی بچوں کے لیے انھوں نے جو نظمیں لکھیں ہیں اس میں ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیتوں کا بھرپور خیال رکھا ہے، ادب اطفال میں یہ نظمیں اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں۔

نشورؔ صاحب نے قطعات، رباعیات، سہرے و دیگر اصناف میں بھی دادِ سخن دی ہے۔ لیکن اصلاً وہ غزلوں کے شاعر تھے، اس میں وہ اپنے عہد کے ممتاز ترین شاعر تھے۔ ان کا غزلوں کا سرمایہ فکری اور فنی دونوں لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہے، عروضی لحاظ سے راقم کو کوئی سقم نہیں ملا، شاید ہی ان کا کوئی شعر بحر و وزن سے خارج ہو، یہ ان کی فنی چابکدستی اور کمال دسترس کا نتیجہ ہے، بڑے بڑے شعراء کے یہاں یہ عیوبِ سخن راہ پا گئے ہیں۔ نشورؔ صاحب نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔

فکری لحاظ سے بھی انھوں نے غزل کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے، پامال موضوعات سے کسی کو مفر نہیں، نشورؔ صاحب نے پامال موضوعات میں بھی اپنی انفرادیت کا نقش قائم کیا ہے۔ دوسرے متعدد معاصر شعرا کی طرح ان کے موضوعات بھی متنوع ہیں، اسرارِ حیات و کائنات، زندگی کی بے ثباتی، حسن و عشق، محبت و شیفتگی، خودی و وارفتگی، رازِ زندگی، تہذیب و تمدّن ان کے اہم موضوعات شاعری ہیں، کہیں کہیں انھوں نے شاعری میں پیمبری بھی کی ہے۔ البتہ اس میں انھوں نے اپنی راہ الگ بنانے کی کوشش کی ہے، شبابیات و خمریات بھی ان کے موضوعِ شعر کا حصّہ بلکہ بنیادی حصّہ ہیں لیکن وہ محض شاعرِ شبابیات و خمریات نہیں۔

وہ اپنے خیالات نئے انداز اور دلکش اسلوب میں پیش کرتے ہیں جسے خود انھوں نے ''تخیل پاک بازانہ مگر انداز رندانہ'' سے تعبیر کیا ہے، یہ وصف جاذبِ نظر اور ذوق و وجدان کی تشنگی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہیں زبان و بیان، الفاظ و محاورات اور استعارات و کنایات کے استعمال پر بھی بڑا درک حاصل تھا، تشبیہات میں جدّت و اختراع اور ندرتِ بیان بھی ان کی شعری خوبیاں ہیں۔

رُخ بدلتے، راہ چلتے، گُل عذاروں کو نہ چھیڑ
اے چمن نا آشنا رنگین بہاروں کو نہ چھیڑ
ہم نہ برگ گل نہ شبنم نے خس و خار چمن
اے نسیم صبح جا ہم خاکساروں کو نہ چھیڑ

....

قامتِ دل ربا پر شباب پر آ گیا
یا سوا نیزے پر آفتاب آ گیا
آیئے آیئے اس طرف وہ نشورؔ
شاعر یادگارِ شباب آ گیا

نشورؔ صاحب کا رنگ تغزل ان کے معاصرین سے انھیں ممتاز کرتا ہے۔ متعدد نقادوں نے ان کے تغزل پر روشنی ڈالی ہے اور تقریباً سبھی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ نشورؔ صاحب کا تغزل ہی دراصل ان کی شاعری کا خوبصورت باب ہے۔ ان کی غزلیں اگرچہ ان کے تغزل، شعریت، نغمگی، بانکپن اور حسنِ ادا کی وجہ سے روح شاعری ہوگئیں اور ذوق و وجدان پر چھا گئیں لیکن اصلاً ان کے اشعار بالخصوص غزلوں میں وہ گھن گرج، آہستہ روی، سبک خرامی، سکوتِ دریا اور پھر اس میں موج وطغیانی کی کیفیت اور قاری کے ذہن و دل کو مسحور کرنے کی جو فضا پنہاں ہے۔ گو وہ ان کے معاصرین میں بھی پائی جاتی ہے، تاہم اس کا مکمل پرتو نشورؔ صاحب کی غزلیں ہیں۔

شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا
نہ کہیں ترا ٹھکانہ نہ کہیں مرا ٹھکانہ

....

کوئی آج تک نہ سمجھا کہ شباب ہے تو کیا ہے
یہی عمر جاگنے کی، یہی نیند کا زمانہ

....

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
نشور آلودہ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے
یہ باتیں راز کی ہیں قبلہ عالم بھی پیتے ہیں

....

اے رہبر منزل خرد ایسی بھی کیا ترقیاں
ہونٹ سے گر پڑے ہنسی، آنکھوں سے پیار چھوٹ جائے

....

ہم ان کو بلائیں کیوں، اچھا ہے خفا ہیں وہ
آئیں تو قیامت ہے جائیں تو قیامت ہے

ان کی غزلوں کے متعدد اشعار قدیم شعراء کے مقابلے میں فخر سے پیش کیے جاسکتے ہیں جس میں انھوں نے انفرادیت کا نقش قائم کیا ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ نشورؔ صاحب کے بعض اشعار فنی چابکدستی اور موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے ان شعراء سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں ذوقؔ، مومنؔ اور فراقؔ وفیضؔ کا خاص طور سے نام لیا جاسکتا ہے۔ فراقؔ جوان کے ہم عصر ہیں، اسی لیے ان کے مداح تھے۔

وہ تصوف کے بھی ذوق آشنا تھے اور یہی وہ شے ہے جس نے ان کی شاعری کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ ان کی مخمور نگاہیں اور ان کی غزلیں دونوں جامِ معرفت سے لبریز ہیں۔

دیا ساقی نے اوّل روز وہ پیمانہ مستی میں
کہ میں نا آشنا پی کر ہوا دیوانہ مستی میں
قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں جا کر
نشورؔ اس وقت ہوں کچھ ہوش سے بیگانہ مستی میں

تصوف کا ایک اور نمونہ یہ ہے:

نورِ قمر نے میرے لیے اِک رشکِ قمر کو روک لیا ہے
اوّل شب سے آخر شب تک جس نے نظر کو روک لیا ہے
تم نے بنائے لاکھوں شیشے عکس کسی میں بھی نہیں ٹھہرا
دل نے بنا کر آئینۂ غم، آئینہ گر کو روک لیا ہے
اپنا نشورؔ انداز جدا ہے فکر حسیں سے آہِ رسا تک
ہم نے فضائے لالہ وگل میں برق وشرر کو روک لیا ہے

وہ اپنی وضع قطع، رہن سہن، طرزِ معاشرت، سادگی، شائستگی، زندگی اور زندہ دلی کے لحاظ سے بھی منفرد تھے۔ ان کی سادہ ودلکش زندگی ان کی غزلوں میں بھی جلوہ گر ہے، یعنی ان کے کلام میں سادگی، صفائی، برجستگی کے جوہر نمایاں طور پر موجود ہیں۔ روزمرہ اور سہل ممتنع کی مثالیں بھی ان کی غزلوں کے نمایاں اوصاف ہیں:

بتاؤں کیا تجھے حاصل فریب زندگانی کا
جو پایا تھا وہ کھو آئے، جو جیتا تھا وہ ہار آئے

....

مرے آنسوؤں کی ادا کون سمجھے
گلوں کا تبسم نہ سمجھا زمانہ

....

کہاں فلک کے شرارے کہاں زمیں کے نجوم
وہ کچھ دنوں ابھی مشق تجلیات کرے

....

سحر کا لطف بھی جاتا ہے جلد لا ساقی
فضا تو دیکھ ستاروں کے جھلملانے کی

....

ہولیے ہم زندگی کے ساتھ
یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے

ترقی پسندی کا بنیادی وصف جدید افکار وخیالات کی ترسیل قرار دیا گیا ہے۔ نشورؔ صاحب بھی اس معنی میں جدّت پسند تھے۔ ان کی غزلوں میں بہتیرے اشعار عہدِ گل کی داستانِ خوں چکاں ہی پر مبنی نہیں، حالات حاضرہ، اور وقت کی آہنی زنجیروں، نارسائیوں اور نامرادیوں کی داستان بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ لیکن اصلاً وہ محبت کے شاعر تھے۔ ان کی محبت صرف شباب ہی سے نہیں، وقت کے دھاروں، چمکتے ہوئے ذرّوں اور تہ خاک تڑپتے ہوئے انسانوں سے بھی ہے، حسن کی مست ادائیں، دلکش نظارے، عشق کی

دلفریب ادائیں، زندگی کے لطف و لذّت ہی کا نام نہیں بلکہ وہ بے ثبات زندگی کے استعارے وکنائے بھی ہیں، موجِ دریا اور طلاطم محض طوفان ہی کا پیش خیمہ نہیں ہوتیں بلکہ نامراد کو ساحل کا پتہ بھی دیتی ہیں، نشور صاحب اسی شعورِ بے شعوری کے شاعر تھے۔

سب کے لیے کشش مرے طرزِ سخن میں ہے
کیا جانے کیا ادا مرے دیوانہ پن میں ہے

....

پیراہن رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے
معصوم ہے کیا جانے دامن کہیں جلتا ہے

....

حقیقت جس جگہ ہوتی ہے تابانی نہیں جاتی
کوئی پردے میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے

واقعہ یہ ہے کہ نشورؔ صاحب اپنے عہد کے شعرا میں نہ صرف اپنے تغزل کی وجہ سے ممتاز ہیں بلکہ فکری وفنی لحاظ سے، شعور کی بالیدگی کے لحاظ سے اور مترنم پیش کش کے لحاظ سے بھی فائق و برتر ہیں، صحیح یہ ہے کہ نشورؔ صاحب کے کلام کو اب تک سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی اور نہ ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا اسے ہم ایک ادبی المیہ ہی قرار دے سکتے ہیں۔

خواجہ حافظ شیرازی سے پہلے ایران اور فارسی شعراء نے تصوف کے زیر اثر ان استعارات کو جو میخانوں اور مے خواروں کے لیے استعمال ہوتے تھے، انھیں تصوف کے مزاج میں ڈھال کر شعر وادب کو میکدہ بنا دیا، مثلاً خانقاہ کے لیے، میخانہ ومیکدہ، طالب و مطلوب کے لیے ساقی ومیخوار، تعلیمات تصوف کو جام ومینا وصہبا وغیرہ بنا دیا۔ ان الفاظ کا رواج و استعمال کثرت سے ہوا، نشورؔ صاحب ادبیات فارسی پر گہری نظری رکھتے تھے۔ فارسی ادب کا یہ مزاج انھیں پسند آیا تو اسے انھوں نے اپنی شاعری میں برتا، دیگر شعرائے اردو کے یہاں بھی اس کے نقوش ملتے ہیں لیکن اسے اردو میں نشورؔ صاحب نے معراج کمال تک پہنچا دیا۔ ان کی غزلوں کے ایک ایک شعر میں اس کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔

کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات

شبابیات وخمریات نشورؔ دراصل اسی شعوری کوشش کا حصّہ ہیں۔ اسے ممکن ہے مبالغہ سمجھا جائے مگر حقیقت یہی ہے کہ نشورؔ صاحب اردو شاعری کے حافظ شیرازی تھے، ان کے تغزل کی رنگینی ودلکشی ان کے ممتاز معاصرین سے مختلف ہے، سوز وگداز درد وتڑپ اور ہجر وفراق میں بھی وہ وہی طرز وادا جو فارسی شعراء میں متاخرین کا وصف خاص تھا۔ استعمال کرتے ہیں لیکن یہ فضا وہ بالقصد نہیں تیار کرتے، بلکہ وہ ان کے دل ودماغ اور ذوق ووجدان میں رچی بسی تھی۔ ان کے اس کلیاتِ غزلیات میں ہر طرح کے جلوے موجود ہیں، جنھیں اوراق آئندہ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ نشورؔ صاحب کی غزلوں کا یہ کلیات ان کے بلند رتبہ، شاعرانہ کمالات اور عظمتِ شاعری کا ایک گنجینہ ہے۔

اس کی ترتیب وتہذیب اور طباعت و اشاعت کے لیے ادبی دنیا کو جناب نیاز واحدی صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ وہ نشورؔ صاحب کے لائق اور قابلِ فخر فرزند ہیں۔ انھوں نے اپنے والد مرحوم کا ایک ایک شعر اور ایک سطر زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے محفوظ کر دیا ہے، وہ خود کو غیر اردو داں خیال کرتے ہیں حالانکہ انھوں نے نشورؔ صاحب کے حوالے سے جو خدمات انجام دی ہیں وہ انھیں ایک ادیب اور محقق کا درجہ عطا کرتی ہیں۔ خاص طور سے عرضِ ناشر کے تحت انھوں نے جو تقدیم لکھی ہے۔ اس سے راقم نشوریات پر ان کی گہری نظر اور جمع وترتیب وتحقیق کی ان کی صلاحیت کا مداح ہے۔ اس دور میں ایسے قابل رشک فرزند کم ادیبوں اور شاعروں کو نصیب ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں صحت وتندرستی اور طویل عمر عطا فرمائے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شورِ نشورؔ کو بانگ درا اور ضربِ کلیم بنا دے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
(اعزازی رفیق، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱)

۴؍فروری ۲۰۱۰ء

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی

کچھ نشورؔ واحدی اور مسعود اختر جمالؔ کے بارے میں

(نشورؔ واحدی: ۱۹۱۲تا ۱۹۸۳؛ مسعود اختر جمالؔ: ۱۹۱۵تا ۱۹۹۱)

آج ہم جن بزرگانِ ادب کی یاد منانے یہاں جمع ہوئے ہیں ان میں کئی باتیں مشترک تھیں، حالانکہ اگر سرسری نظر سے دیکھیں تو دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی اور کارناموں پر تھوڑا سا بھی غور ان باتوں کو واضح کردے گا جن کی بنا پر ان دونوں صاحبان کا ذکر ایک ساتھ کرنا ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو دونوں کا الٰہ آباد سے قریبی تعلق ہے۔ نشور واحدی نے زمانۂ نوجوانی تک تعلیم الٰہ آباد میں حاصل کی اور قرآن، حدیث، فقہ کے بارے میں جو کچھ انھوں نے سیکھا وہ آخری عمر تک ان پر اثر انداز رہا۔ مسعود اختر جمالؔ نے اپنی زندگی کے آخری چھ سات سال الٰہ آباد میں گذارے اور وہ یہیں سپردِ خاک ہیں۔ ان کی بیگم بھی الٰہ آباد کی ہیں۔ دوسری وجہِ اشتراک یہ کہ اپنے اپنے رنگ میں دونوں قومی شاعر تھے۔ مسعود اختر جمالؔ نے جنگِ آزادی میں باقاعدہ حصّہ لیا اور ترقی پسند تحریک کے نمایاں فرد کی حیثیت سے قبل آزادی کے دنوں میں انھوں نے انقلاب کے گیت گائے۔ آزادی کے بعد ان کی توجہ قومی و ملکی مسائل اور اردو زبان کے معاملات کی طرف مرکوز رہی۔ نشورؔ واحدی عملی دنیا کے آدمی نہ تھے، لیکن انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی آزادی کی جدوجہد اور پھر قومی یکجہتی کی قوتوں کا ساتھ دیا۔ مسعود اختر جمالؔ کے پہلے تین مجموعے ''نورس''، ''اردو زباں ہماری'' اور ''جشنِ آزادی'' بیش تر قومی اور ملی نظموں پر مشتمل ہیں۔ نشورؔ واحدی کا بھی پہلا مجموعہ ''صہبائے ہند'' حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات سے رنگین ہے۔ تیسری بات یہ کہ

جس طرح نشورؔ واحدی عمر کے آخری دنوں میں تصوّف اور مذہب کی طرف شدت سے مائل ہوگئے تھے اور انھوں نے ''تاریخ فلسفۂ خودی'' کے نام سے ایک کتاب مرتّب کی تھی جس میں صوفیانہ افکار تھے، اسی طرح مسعود اختر جمالؔ بھی اپنے آخری زمانے میں پیغمبر اسلامؐ کی محبت میں سرشار تھے۔ ان کی طویل خوبصورت نظم ''پیغمبر اسلام'' اسی محبت کی یادگار اور ایک ایسے شاعر کا خراج عقیدت ہے جو تشکیک اور تجسس کی کئی کٹھن منزلیں جھیل کر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے تک پہنچا تھا۔

لہٰذا اشتراک کی ان متعدد وجوہ کی بنا پر یہ مناسب ہے کہ ہم آج الٰہ آباد میں نشورؔ واحدی اور مسعود اختر جمالؔ کی یاد منائیں، ان کی شاعری پر اظہار خیال کریں، ان کو خراج محبت وعقیدت پیش کریں اور ان کے ادبی مرتبے کا تعین کریں۔ مجھے دونوں صاحبان کی خدمت میں تھوڑا بہت نیاز حاصل تھا۔ نشورؔ واحدی سے میرے مراسم زیادہ تھے، کیوں کہ وہ میرے دور کے عزیز ہوتے تھے اور اس کے علاوہ میں کوئی دو سال کانپور میں رہا بھی ہوں۔ مسعود اختر جمالؔ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا اس کی وجہ کچھ تو ان کی گوشہ نشینی اور کچھ یہ کہ جب وہ رائے بریلی یا الٰہ آباد میں قیام پذیر تھے، ان دنوں میں الٰہ آباد سے بہت دور تھا۔ پھر بھی ان دونوں کے کلام سے میں اس وقت سے واقف ہوں جب سے میں نے ہوش سنبھالا بلکہ نشور واحدی کے بہت سے اشعار میرے کانوں میں اس وقت پڑے تھے جب میں بہت ہی کم عمر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اعظم گڑھ میں، جہاں میرا بچپن گذرا، ہمارے پڑوس میں ایک صاحب نشورؔ صاحب کا کلام راتوں کو ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ یہ بات ۱۹۴۴ء کی یا ۱۹۴۵ کی ہے۔ اس وقت کا ایک شعر اب بھی مجھے یاد ہے ؂

کرے زمانہ وفا اس سے یا کرے خاموش
ہم ایک چراغ محبت جلائے جاتے ہیں

تقریباً اسی زمانے کا یہ شعر بھی اب تک حافظے میں محفوظ ہے ؂

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

مسعوداختر جمالؔ کا نام میں نے اس زمانے میں سنا جب وہ بنارس سے ''اضطراب'' نکالتے تھے۔ افسوس کہ یہ رسالہ بہت دن نہ چلا۔ اس میں ایک انفرادیت تھی اور طباعت و کتابت کا ایک حسن تھا جو اس کے مدیر کی نفاستِ طبع کا غماز تھا۔ اس کا ایک شمارہ مجھے بخوبی یاد ہے جس میں مسعوداختر جمالؔ کی طویل نظم ''صبح بنارس'' شائع ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے اس موضوع پر اس سے بہتر نظم اردو میں مشکل سے ملے گی۔ اس کا ایک بند مجھے یاد آتا ہے۔

دلکش منظر حد نظر تک
حد نظر تک دلکش منظر
لرزش لہروں میں ہلکی سی
جیسے فسوں برلب ہو فسوں گر

''اضطراب'' ہی کے کسی شمارے میں مسعوداختر جمالؔ کا قطعہ تھا جو اس زمانہ کے رومانی رنگ میں تھا، لیکن اس میں ایک ایسی دبی دبی حزنیہ کیفیت تھی جو اس طرح کے شاعروں، مثلاً مجازؔ کے یہاں نہیں ملتی۔

کچھ تو ہوتا ان آنسوؤں میں اثر
داغ ہی میرے دل کے کھو دیتے
یا ترے گیسوے پریشاں میں
موتیوں کی لڑی پرو دیتے
اور کچھ بھی نہیں تو پھر اے کاش
غم کے سیلاب میں مجھے ڈبو دیتے

افسوس ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب زمانے کی بساط الٹی تو مسعوداختر جمالؔ ان لوگوں میں شامل نہ ہو سکے جو بدلے ہوئے موسم میں بہار کا لطف لے رہے تھے۔ وہ ترقی

پسند تحریک کے اوّلین اور سربرآوردہ شاعروں میں تھے، لیکن جب ترقی پسند ادیبوں کو انعام واعزاز تقسیم ہونے لگے تو مسعوداختر جمالؔ نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں نے مجازؔ کا ذکر ابھی کیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مجازؔ نے جمالؔ کو متاثر کیا یا جمالؔ نے مجازؔ کو۔ لیکن ان دونوں کی شاعری میں ایک دوسرے کی جھلک نظر آتی ہے۔ جمالؔ کی نظمیں ''باغی کا ترانہ'' (۱۹۳۶) اور ''نئی دنیا'' (۱۹۳۷) اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ رنگ جسے ہم مجازؔ کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، جمالؔ کے یہاں شاید کچھ پہلے سے موجود تھا اور اسی آب وتاب کے ساتھ۔ مسعوداختر جمالؔ کے کلام میں استادانہ زور اور نوجوانی کی بے ساختگی کی جو آمیزش ہے وہ آخری عمر تک ان کے ساتھ رہی۔ ان کے شروع کے زمانے کے بعض اشعار بجا طور پر مشہور ہوئے۔

دوری منزل سے میرا شوق کم ہوتا نہیں
کارواں سو جائے لیکن میں کبھی سوتا نہیں (باغی کا ترانہ)
چشم خورشید مگر باز یہاں رہتی ہے
زندگی مائل پرواز یہاں رہتی ہے (آسمان)

مسعوداختر جمالؔ کی وہ قدر نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کی حق گوئی اور بے باکی بھی شاید ان کے حق میں مفید نہ ثابت ہوئی۔ لیکن انھوں نے حالات سے مصالحت نہ کی اور نہ اپنے خیالات کے برملا اظہار میں انھیں کسی قسم کی جھجک محسوس ہوئی۔ مارکس پر طویل نظم لکھ لینے کے بعد ان کا دل پیغمبرِ آخرالزماں کی طرف مائل ہوا تو انھیں اس بات میں کوئی تکلف نہ ہوا کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کریں۔ مارکس پر ان کی نظم سیاسی اور سماجی افکار کو شعری پیرایہ بخشنے کی کوشش ہے، اور میرا خیال ہے بہت کامیاب نہیں ہے۔ لیکن رسول اللہؐ کی خدمت میں ان کی نظم اور ہی عالم رکھتی ہے۔

مسعوداختر جمال کی غزلیں بھی اس استادانہ صفائی اور اظہار کی مضبوطی کی آئینہ دار

ہیں جو ان کی نظم کا خاصہ تھا۔ بیشتر ترقی پسند شاعروں کی طرح وہ بھی اصلاً قصیدے کی روایت کے شاعر تھے۔ لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی نے صحیح لکھا ہے کہ مسعود اختر جمالؔ کو ''اظہار پر پوری قدرت ہے اور قدیم سانچوں میں بھی ایک نوع کی تازگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے۔'' ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اپنے زمانۂ نوجوانی کے دوسرے شاعروں کے برخلاف مسعود اختر جمالؔ نے اپنی شاعری کو بے جا لفاظی اور نعرے کی گھن گرج سے پاک رکھا۔ عام ترقی پسند شاعری جس طرح فارمولے اور نعرے سے ترتیب دی گئی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ چند دنوں بعد یہ شاعری فرسودہ ہو جائے۔ مسعود اختر جمالؔ نے فنکارانہ احتیاط سے کام لیتے ہوئے اپنے کلام کو کم و بیش کلاسیکی رنگ پر رہنے دیا۔

مسعود اختر جمالؔ کے برخلاف نشورؔ واحدی کی غزل پڑھیے تو کلاسیکی غزل کے سانچے ٹوٹتے نظر آتے ہیں۔ میں جب بھی نشورؔ واحدی کا کلام پڑھتا ہوں تو ان کے معنوی حسن سے زیادہ ان کا ترنم اور نغمگی مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ محمد حسن نے ان کی شاعری کو معنی آفرینی کا حامل بتایا ہے اور کہا ہے کہ معنی آفرینی کی جان نغز گوئی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ محمد حسن ''معنی آفرینی'' کی اصطلاح کو غلط سمجھے ہیں۔ نشورؔ واحدی کی شاعری کا معنی آفرینی سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی نغز گوئی معنی آفرینی کی کوئی صفت ہے۔ ''نغز گوئی''، محض ایک فقرہ ہے، اس کا تعلق غزل یا کسی مخصوص صنف سے نہیں اور ''معنی آفرینی'' سے مراد ہے ایسا کلام کہنا جس میں ایسے معنی ہوں جو عام طور پر اس کلام سے متوقع نہ ہوں، یا پھر جس میں ایک سے زیادہ معنی کے امکانات ہوں۔ یعنی تہ دار بات کہنا اور ایسا شعر کہنا جو معنی کثیر کا حامل ہو، معنی آفرینی کہلاتا ہے۔ نشورؔ واحدی کی صفت معنی آفرینی نہیں، بلکہ کیفیت آفرینی تھی۔ اکثر و بیشتر ان کے شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی، لیکن وہ اس معمولی بات کو اس طرح کہتے ہیں کہ ہمارے دل میں جذبات و تاثر کی لہر اٹھنے لگتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نشورؔ واحدی کا کلام بآواز بلند پڑھنے کے لیے بہت مناسب ہے، کیوں کہ اس میں روانی بہت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار زبان زد

خاص و عام ہو گئے ہیں۔

ہر ذرۂ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

ہزار شمع فروزاں ہو روشنی کے لیے
نظر نہ ہو تو اندھیرا ہے آدمی کے لیے

نقاد سے دلبر سے احباب سے دنیا سے
شاعر کو نشورؔ آخر کس کس سے شکایت ہے

یہ آخری شعر بہت دلچسپ ہے۔ خود نشورؔ صاحب کو تو نقاد سے کوئی شکایت نہ ہوگی، کیوں کہ وہ بے نیاز قسم کے انسان تھے۔ انھیں اپنی شاعری کے سوا کسی سے کوئی مطلب نہ تھا، اور نہ وہ اس احساس کمتری میں مبتلا تھے جس کے ازالے کے لیے آج کل کے شعرا نقادوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں کہ کچھ لکھ دیجیے۔ نشورؔ صاحب نے اس شعر میں ایک اصولی بات کہی ہے کہ شاعر کو عام طور پر اس بات کا احساس ہوتا رہتا ہے کہ نقادوں نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، یا مجھے نظر انداز کیا۔ ایک زمانے میں شاعر کو شکایت تھی کہ میں اپنی بات پوری طرح نہیں کہہ سکتا۔ ملاحظہ ہو، یہ مصرع نظیری جیسے زبردست قادرالکلام کا ہے۔ ع

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کرد

لیکن بعد کے زمانے میں شاعر کو یہ شکایت بھی ہونے لگی کہ جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے اس کے سمجھنے والے نہیں ہیں۔ نقاد سے عام طور پر توقع ہوتی ہے کہ وہ شاعر اور اس کے قاری یا سامع کو یکجا کر دیتا ہے۔ نقاد سے جو شکایت نشورؔ صاحب کے اس شعر میں ہے وہ یقیناً اسی بنا پر ہے کہ شاعر اور قاری کے درمیان مفاہمت اور تفہیم کا عمل نہیں کرتا، بلکہ اپنے مخصوص لوگوں ہی کی مدح و ثنا کرتا رہتا ہے اور بہر حال نشورؔ واحدی کی قدر کرنے والوں میں محمد حسن جیسا سخت ترقی پسند بھی تھا تو محبوب خزاں جیسا جدید شاعر بھی تھا۔ محبوب خزاں

نے مدتوں پہلے شکایت کی تھی کہ آج کل کے لوگ نشورؔ واحدی کے رنگ تغزل سے بیگانہ ہوئے جاتے ہیں۔

''اشک چکاں سے عصرِ رواں تک'' نام کا مجموعہ جو نشورؔ واحدی کے انتقال کے بیس برس بعد شائع ہوا، اس میں ان کی مشہور غزلوں کے علاوہ بعض غیر مطبوعہ کلام بھی ہے۔ یقین ہے کہ یہ غزلیں ان کے آخری زمانے کی ہوں گی۔ ان میں ایک شعر حسب ذیل ہے ؎

فکر میں وسعت ہو اور گہرا ہو کچھ رنگ غزل
جانتے ہیں سب نشورؔ اس طرز کا بانی مجھے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ''گہرا ہو کچھ رنگ غزل'' سے مراد یہ ہے کہ شعر کے آہنگ کی روانی اور شاعر کے لہجے میں ایک طرح کی سرشاری ہو (جگرؔ صاحب کا بھی یہی انداز تھا) تو نشورؔ واحدی کا یہ بیان اپنے بارے میں بالکل درست ہے۔ ان کا شعر تقریباً بے حد رواں اور ان کی شعر کی کیفیت عام طور پر محویت اور اپنے آپ میں سرشار رہنے کے ساتھ ساتھ کاروبارِ حیات سے غیر متعلق نہ رہنے سے عبارت ہے۔ اسی کو غالباً نشورؔ واحدی نے ''فکر میں وسعت'' کا نام دیا ہے۔ غیر مطبوعہ کلام کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کوئی دھوم دھام یہاں نہیں غم و درد عام یہاں نہیں
کسی شہر علم و کمال میں یہ برات ہو تو بتایئے
وہ دلوں کے گوشے نہیں رہے جہاں تھی نشورؔ کی اِک جگہ
کسی اور شہر نکل چلیں ابھی رات ہو تو بتایئے

....

کسی کو نیند آ سکتی ہے کیا بزمِ تہتک میں
جسے کہیے زمانہ درد نا خوابیدہ ہے وہ بھی

پہلی بات تو یہ کہ ان شعروں کی زبان اور لہجے میں ایک بے تکلفی اور ساتھ ساتھ تھوڑی سی تلخی بھی ہے۔ یہ صفات شروع کے کلام میں بہت کم ہیں۔ آخر کے کلام میں ان کا

وارد ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر نے اپنی گذشتہ حدود کو توڑ دیا ہے۔ اب یہاں زمین پہلے سے بہت کشادہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ عام طور پر نشورؔ واحدی کو ''ترنم کا شاعر'' کہہ کر قصّہ تمام کر دیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ نشورؔ واحدی کی شہرت اور مقبولیت کو قائم کرنے میں ان کے ترنم کا بڑا حصّہ تھا۔ لیکن تیسرے شعر کو دیکھئے اور سوچئے کہ کیا کوئی ترنم باز شاعر ''تہتک'' جیسا لفظ استعمال کرسکتا ہے؟ استعمال کرنا تو دور رہا، اسے ایسا لفظ سوجھے ہی گا نہیں۔ بجا کہ دوسرا مصرع اتنا اچھا نہیں جتنا کہ مصرع اولیٰ ہے، لیکن نئے لفظ کی توقیر بہرحال ہونی چاہیے۔ چند شعر اور دیکھیے ؎

ہمیں تم ہیں رموز بزم ہستی
زمانہ ایک انداز بیاں ہے
دانائی کے پردے میں روپوش ہے نادانی
ہم کو ہے خبر لیکن ہم کو بھی خبر کیا ہے
کچھ مانگ خدا سے کہ زندگی ہے وبال
حیات کی تری دنیا میں کچھ کمی بھی نہیں
کبھی قید مغرب کبھی قید مشرق
جو آزاد ہوتے قفس کیوں بدلتے
ہواؤں کی رفتار ہے تیز اتنی
چمن بچ گیا ہے کچلتے کچلتے

ان اشعار میں طنز کی تھوڑی سی تلخی اور ہلکا سا تصوّف کا بھی رنگ ہے۔ ہر چند کہ استعارہ بہت تازہ اور توجہ طلب نہیں ہے، لیکن ابہام و اسرار کی ہلکی سی کیفیت ضرور ہے۔ ہمیں تم ہیں رموز بزم ہستی کہنا کچھ زیادہ مشکل نہیں، اور لفظ ''بزم'' یہاں بے مصرف بھی ہے، لیکن زمانے کو ایک انداز بیاں کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ وہی بات اس مصرعے میں بھی ہے کہ ہم کو ہے خبر لیکن ہم کو بھی خبر کیا ہے۔ اسی طرح کی بے تکلفی حسب ذیل اشعار

کوعمومیت سے بچا کر غزل کی بے ساختگی عطا کر دیتی ہے۔

تم آؤ تو پورا فسانہ سمجھ لیں
یہ شاعر ادھوری کہانی کہیں گے

میرے آنسو دل شکن ان کے تبسم دلفریب
یہ بھی کام آتے نہیں اور وہ بھی کام آتے نہیں

دل کی یہ شکستگی بہت ہے
اک لمحۂ آگہی بہت ہے

یاد ان کو کیا کہ آ گئے وہ
ان اشکوں کی زندگی بہت ہے

دونوں جانب ہیں تکلف کے گھروندے آباد
دور تک عشق و محبت کی گلی جاتی ہے

آخری شعر میں لہجہ بے تکلفی کا ہے لیکن مضمون خاصا پیچیدہ ہے۔ ''تکلف کے گھروندے'' کس قدر خوبصورت پیکر اور کس قدر چونکا دینے والا استعارہ ہے۔ دوسرا مصرع سر بسر استعارہ ہے۔ بات پھر بھی پوری طرح کھلتی نہیں کہ تکلف کے دو رویہ گھروندے جو دور دور تک چلے گئے ہیں وہ عشق و محبت کی شان اور صفت کے طور پر لائے گئے ہیں، یا عشق و محبت کے عیب بیان کرنے کے لیے۔

''آتش و نم'' (۱۹۴۶) کے دیباچے میں فراق صاحب نے لکھا تھا کہ ''نشور کی شاعری کہیں سے بے رنگ ہے نہ بد رنگ۔ وہ چھوٹی باتیں یا اوچھی باتیں نہیں کہتے۔ وہ زندگی کا دامن مضبوطی سے اپنی مٹھی میں پکڑے ہوئے ہیں۔'' فراق صاحب کی آخری دو باتیں تو ٹھیک ہیں، لیکن پہلی بات پوری طرح صحیح نہیں۔ غالباً مشاعرے کی مجبوری نے نشور واحدی کو آمادہ کیا کہ ہر غزل میں ایک ہی دو شعر غیر معمولی ہوں (کیونکہ ایسے شعر عموماً سامعین کے سر کے اوپر گذر جاتے ہیں) اور باقی شعروں میں سرسری، عمومی باتیں ہوں۔

مندرجہ ذیل کو دیکھیے۔ ردیف نہایت کھٹکتی ہوئی، قافیہ خود بھی مترنم، لہٰذا نشور واحدی کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ایک غیر معمولی شعر کہہ دیں اور باقی اشعار میں سامنے کی بات کہہ کر نکل جائیں۔ وہ غیر معمولی شعر یہ ہے۔

پھر حقیقت کی اسی جنت کی جانب لوٹ کر
بندگی کو لغزشِ آدم بنا سکتا ہوں میں

اس شعر میں تاریخ، اسطور، تصوف، کئی چیزیں گھل مل گئی اور یہ ایک شعر بقیہ تمام غزل پر بھاری ہے۔ اسی طرح، ایک بہت عمدہ زمین میں سرسری شعر کہتے کہتے نشور واحدی نے ایک شعر میں حافظ اور اقبال کی سرحدوں کو چھو لیا۔

مدرسۂ تصورات غرقِ شراب شوق کر
مجھ کو کہ میں ہوں مردِ علم کچھ نہ کتاب سے ملا

نشور واحدی نے فکر اور خیال کی دنیا میں کئی منزلیں طے کیں۔ ان کا کلام اب بھی جگہ جگہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔ ان کا ہر شعر ان کے ترنم میں بھی اس طرح ڈوبا ہوا ہے کہ جس نے بھی انھیں پڑھتے ہوئے سنا ہوگا، اس نے ان کی غزل کو پڑھتے ہوئے اس ترنم کا جادو بھی ضرور محسوس کیا ہوگا۔

(۱۹۸۵ء، نظر ثانی ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی
۲۹۔سی ہیسٹنگ، الٰہ آباد۔۲۱۱۰۰۱

نیاز واحدی

نشورؔ واحدی اور ان کی تخلیقات

جناب نشورؔ واحدی کا نام حفیظ الرحمٰن تھا۔ نشورؔ تخلص اور واحدی آبائی نسبت۔ آپ کے والد کا نام جمیل احمد یکتاؔ تھا۔ نشورؔ صاحب کے خاندان کا نسبی تعلق شیخ المشائخ مخدوم حاجی سیّد محمد شاہ پھول جونپوری سے ہے جو خواجہ سید کمال الدین علامہ کے پوتے تھے، خواجہ سید کمال الدین علامہ خواجہ سید نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی کے حقیقی بھانجہ تھے اور خواجہ نظام الدین اولیا اور خواجہ سید نصیر الدین محمود اودھی دونوں حضرات کے خلیفہ تھے۔ خواجہ سید نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی کے وصال کے بعد دہلی کی خلافت آپ کے ہی حصّہ میں آئی آپ کا مزار مبارک درگاہ روشن چراغ دہلی میں مرجع خلائق ہے۔

جناب حفیظ الرحمٰن نشورؔ واحدی ۱۵/اپریل ۱۹۱۲ء میں اپنے ننہال موضع چندائر ضلع بلیا، یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن موضع شیخ پور چک حاجی ضلع بلیا یوپی ہے۔ جس کا اصل نام موضع شاہ پھول چک حاجی تھا جو اب بگڑ کر شیخ پور ہو گیا ہے۔ پہلے یہ مقام ضلع غازی پور کا حصّہ تھا بعد میں ضلع بلیا میں شامل کیا گیا۔

نشورؔ واحدی صاحب ۱۹۳۰ء میں کانپور آ گئے تھے اور یہی شہر ان کا وطن ثانی بنا۔ ۴/جنوری ۱۹۸۳ء کو کانپور میں اپنی آخری رہائش گاہ ۹۸/۳۷ ناظر باغ، بیکن گنج میں بوقت ڈھائی بجے دن کو خالقِ حقیقی سے جا ملے اور پانچ جنوری ۱۹۸۳ء کو جناب خلیل اللہ صاحب ایڈوکیٹ مرحوم ساکن ڈپٹی کا پڑاؤ، کانپور کے خاندانی قبرستان نزد فرنیچر مارکٹ

بکر منڈی بڑی عید گاہ روڈ، کانپور میں مدفون ہوئے۔ نماز جنازہ اُن کے دوست مولانا ظفر الدین مرحوم قلی بازار، کانپور نے پڑھائی۔

نشورؔ واحدی صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیمات موضع چندائر، موضع شیخ پور اور دیوریا، جونپور، یوپی میں حاصل کر کے ۹ سال یا ۱۰ سال کی عمر یعنی ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں اپنے چچازاد بھائی شاہ محمد عمر فارسی لکچرر بنگالی کالج الٰہ آباد کے ساتھ الٰہ آباد آ گئے اور جناب ولی محمد عطار مرحوم بہادر گنج الٰہ آباد کے یہاں مقیم ہوئے، کیونکہ ولی محمد عطار اور اُن کے خاندان کے لوگ بزرگانِ شیخ پور کے بہت عقیدت مند تھے اور اہلیانِ شیخ پور کو اپنے یہاں ٹھہرانے اور ان کی خدمت کرنے کو باعثِ برکت خیال کرتے تھے۔

نشورؔ واحدی صاحب نے مدرسہ مصباح العلوم اور مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۲۴ء میں منشی، ۱۹۲۶ء میں کامل کے امتحانات پاس کیے اور نو یا دس[۱] سال کی عمر میں ہی دائرہ محمد الٰہ آباد میں اس وقت کے مشہور بزرگ مولانا خواجہ عبدالشکور چشتی قادری الٰہ آبادی کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ جہاں انھوں نے تصوّف اور طریقت کی باطنی تعلیم مکمل کی۔ مولانا خواجہ عبدالشکور صاحب کے وصال کے بعد دوسرے صاحب سجادہ مولانا عبدالرؤف صاحب سے سلسلۂ چشتیہ سلسلۂ قادریہ سلسلۂ صابریہ اور سلسلۂ نقشبندیہ

۱۔ نشورؔ واحدی کی اسناد کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں منشی کا امتحان پاس کیا تھا، اس لیے وہ ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں ۹ یا ۱۰ سال کی عمر میں الٰہ آباد آئے ہوں گے، کیونکہ دو سال منشی اور دو سال کامل کے امتحانات پاس کرنے میں لگے ہوں گے۔ نشورؔ صاحب نے اپنے اکثر انٹرویو یا مختلف اداروں یا رسائل کے ایڈیٹروں کی فرمائش پر بتایا یا لکھ کر بھیجا کہ وہ ۱۵ سال کی عمر میں مولانا عبدالشکور صاحب کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ نشورؔ صاحب کے کہنے کے بموجب کہ مولانا کا یہ کہنا کہ ''اب تمھاری چھٹّی ہے جا کر کھیلو'' مولانا یہ بات پندرہ سال کی عمر کے نشورؔ واحدی سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ نشورؔ صاحب ۱۶ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور انھیں مدرسوں میں جہاں وہ پڑھتے تھے، درس دینے لگے تھے۔ اس بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۹ یا دس سال کی عمر میں مولانا کی خدمت میں پیش کیے گئے ہوں گے۔

کی خلافت واجازت حاصل کی۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نشورؔ صاحب اسی درسگاہ میں جہاں انھوں نے تعلیم مکمل کی تھی یعنی مدرسہ مصباح العلوم اور مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں ہی درس وتدریس میں لگ گئے۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا عبدالستار صاحب منیجر و ہیڈ ماسٹر مدرسہ ضیاء العلوم قلی بازار کانپور کسی کام سے الہ آباد گئے اور مدرسہ میں نشورؔ صاحب کو پڑھاتے ہوئے دیکھا تو ان کی قابلیت اور طریقۂ درس سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں اپنے ساتھ کانپور لائے اور اپنے مدرسہ میں عربی اور فارسی کے مدرس کے طور پر ان کا تقرر کردیا، جہاں نشورؔ صاحب اپنی عمر سے دوگنی تین گنی عمر کے طلباء کو پڑھاتے تھے۔ طلبا میں زیادہ تر کسی اسکول یا کالج کے مدرس ہوا کرتے تھے۔ اسی درمیان وہ کچھ عرصہ کان کبج کالج کانپور میں بھی اردو فارسی کے استاد رہے اور ۱۹۴۰ء میں امیر چند مہرا پرنسپل گرنرائن کھتری کالج کانپور کی فرمائش پر گرنرائن کھتری کالج کانپور میں انھوں نے اردو اور فارسی کے درجات پڑھانے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ تقسیم ہند کے قریب ۱۹۴۷ء میں پرنسپل عبدالشکور کی فرمائش پر وہ حلیم مسلم کالج کانپور آ گئے اور پھر اسی کالج سے ۳۰/جون ۱۹۷۲ء کو ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔

مدرسہ ضیا العلوم قلی بازار کانپور میں ملازمت کے درمیان ہی انھوں نے اردو اعلیٰ قابلیت (اردو ایڈوانس ایکزامنیشن) کا امتحان پاس کیا اور طب کی تعلیم حکیم پیارے صاحب لکھنوی سے حاصل کر کے طب کی سند (تکمیل الطب) حاصل کر کے اپنا رجسٹریشن بھی کرایا اور حکیم محمد شفیع کے مطب گڈریہ محال کانپور میں کچھ عرصہ طبابت بھی کی۔ ہومیو پیتھک طریقہ علاج سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ محلّہ گڈریہ محال کانپور کے دوران قیام وہ غریبوں کا علاج ہومیو پیتھک کی دواؤں سے بھی کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے انگریزی میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور پھر نجی طور پر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتے رہے۔

۱۹۳۰ء ہی میں جب وہ کانپور بسلسلۂ ملازمت تشریف لائے اسی سال ان کی

شادی دیوریا کے ممتاز ایڈوکیٹ خان بہادر (خطاب) الحاج مولوی محمد حامد چشتی کی منجھلی صاحبزادی محترمہ مومنہ چشتی سے ہوئی۔ محترمہ مومنہ چشتی نشورؔ صاحب کی وفات کے بعد تقریباً بیس سال زندہ رہیں اور ۱۹/دسمبر ۲۰۰۳ء میں لکھنؤ میں ان کی وفات ہوئی اور پیپر مل کالونی نشاط گنج کے قبرستان میں ۲۰/دسمبر ۲۰۰۳ء کو مدفون ہوئیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مفتی محمد ظہور صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بیگم نشورؔ واحدی نے نشورؔ صاحب کی وفات کے بعد ان کی تخلیقات کو شائع کرانے میں بہت دلچسپی لی اور ریسرچ اسکالرز کو ہر ممکن تعاون پیش کرتی رہیں۔ کماری اوما چکبست جو پنڈت برج نرائن چکبست کی پوتی ہیں اور ریڈیو لکھنؤ سے بھی منسلک رہی تھیں انھوں نے اپنے ایم۔ اے کے ڈیزرٹیشن پیپر میں پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کی نگرانی میں ''نشورؔ واحدی فن وشخصیت'' کے موضوع پر اپنا مقالہ تحریر کیا تھا جو کتابی صورت میں ۱۹۸۸ء میں نشورؔ واحدی کے نام سے شائع ہوا تھا اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد ارشد خاں نے پروفیسر احمر لاری گورکھپور، یوپی کی نگرانی میں اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا تحقیقی مقالہ ''نشورؔ واحدی فن اور شخصیت'' پر مکمل کر کے گورکھپور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ۱۹۹۱ء میں حاصل کی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان پروفیسر حنیف نقوی، بنارس ہندو یونیورسٹی، ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی بھوپال ایم۔ پی، پروفیسر محمود الحسن لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر شمیم انہونوی، پروفیسر ابوالحسانت، کانپور یونیورسٹی وغیرہ کی نگرانی میں بہت سے ریسرچ اسکالرز نے نشورؔ واحدی، فن وشخصیت کا موضوع لے کر تحقیق کا کام شروع کیا مگر تکمیل تک نہیں پہنچ سکے۔ بیگم نشورؔ واحدی نے ان تحقیقی امور میں اپنا بھرپور تعاون پیش کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ثروت واحدی بنت نشور واحدی اس کام کو بہ حسن وخوبی انجام دے رہی ہیں۔

بچپن ہی سے نشورؔ واحدی صاحب مذہبی ادبی وشعری ماحول میں رہے۔ بہت

چھوٹی عمر میں ہی انھیں مولانا آسیؔ سکندر پوری (مزار مبارک غازی پور شہر میں مرجع خلائق ہے) کی غزلیں یاد کرائی گئی تھیں جو وہ ترنم کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔حضرت آسیؒ کی ایک غزل کے چند شعر جو نشورؔ واحدی صاحب سنایا کرتے تھے۔

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پے چیدہ ہے
بلبلا ہے عینِ دریا میں مگر نم دیدہ ہے
اتنے بت خانوں میں سجدے ایک کعبے کے عوض
کفر تو اسلام سے بڑھ کر ترا گرویدہ ہے
دیکھ کر محشر خرامی اُن کی اب سمجھا ہوں میں
ذرّہ ذرّہ کاروانِ فتنۂ خوابیدہ ہے
حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیؔ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

طالب علمی کے دور میں نشورؔ صاحب بات بات پر شعر موزوں کیا کرتے تھے۔

الہ آباد کے قیام کے دوران ایک بار وہ اپنے ایک دوست قمر الہدیٰ صاحب سے ملنے گے جو اوپر کی منزل پر رہتے تھے زینے کا دروازہ بند تھا۔ دوست نے دروازہ کھولے بغیر کہا چلے آؤ۔۔۔ چلے آؤ۔اس پر نشورؔ صاحب نے کہا ۔

چرخِ عیسیٰ سے کھڑے کہتے ہو آؤ، آئیں کیا
کس قدر ناداں ہو تم قمر الہدیٰ بتلائیں کیا

اسی طرح ایک صاحب بغیر سائیکل کے دو قدم بھی نہیں چلتے تھے اس سلسلہ میں یہ شعر کہا ۔

ہوگیا ہے آج کل ایسا جنون سائیکل
اِک قدم بھی چل نہیں سکتے بدون سائیکل

الہ آباد میں ان کے کسی استاد نے مصرع طرح پر شعر کہنے لیے کہا۔مصرح طرح تھا۔

''شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے''

نشورؔ صاحب نے اکبرؔ الہ آبادی کے رنگ میں دو شعر کہہ کر سنائے ۔

اصحاب زن مرید بصد گریہ و خوشی
برسوں نماز پڑھتے ہیں سالوں کے سامنے
خامش ہیں قورما و تنجن کی سب پلیٹ
مارہرۂ شریف کی دالوں کے سامنے

اسی زمانے میں انھوں نے ایک نعت بھی کہی تھی مگر اس کو کہیں محفوظ نہیں رکھا۔

ذہن میں چند مصرعے بچپن سے یاد ہیں جو پیش ہیں ۔

اللہ اللہ رے تیرا نکھار مدنی
زلفِ شب رنگ مکھڑا بہار مدنی
تیری چتون پہ جاؤں نثار مدنی
جس نے دیکھا شہید وفا ہوگیا
انتظار انتظار انتظار مدنی

نشورؔ واحدی صاحب نے شاعری میں کسی کا تلمّذ حاصل نہیں کیا۔کسی کے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا تھا کہ ۱۶ سال کی عمر میں حدایق البلاغت، معیار الاشعار طوسی اور علم معانی وغیرہ کا درس دیتے تھے۔عربی و فارسی زبانوں پر انھیں مکمل عبور حاصل تھا اس لیے انھیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی اور بقول خود اُن کے

''خود ہی لکھتے کاٹتے سمجھتے سمجھاتے رہے''۔

الہ آباد کے دورانِ قیام شعر کہنے لگے تھے مگر شاعری کا باقاعدہ آغاز مدرسہ ضیاء العلوم قلی بازار کانپور کی ملازمت کے دوران ۲۰ سال کی عمر میں ۱۹۳۲ء میں ہوا جب وہ اپنا

مجموعۂ کلام ''صہبائے ہند'' کی تخلیق کر رہے تھے۔ ۲۲ سال کی عمر میں ۱۹۳۴ء میں حسبِ معمول قرآن شریف کی تلاوت کے دوران انھیں ایک لفظ ''الیہ النشور'' ملا۔ انھیں یہ لفظ بہت پسند آیا اور اُنھوں نے اپنا تخلص نشورؔ واحدی رکھ لیا۔ ۱۹۳۸ء میں جب وہ ۲۶ سال کے تھے، تب اُن کا مجموعہ ''صہبائے ہند'' پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس وقت تک علاوہ چند احباب کے نشورؔ واحدی صاحب کو کوئی بحیثیت شاعر نہیں جانتا تھا۔ وہ شہر میں عربی و فارسی زبان کے منتہی کے طور پر مشہور تھے اور خاص و عام اُنھیں 'مولانا' کے لقب سے ہی مخاطب کرتے تھے۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں ایک یادگار تاریخی مشاعرہ ہوا جس میں حضرت جگرؔ مرادآبادی کے علاوہ ملک کے مایۂ ناز غزل گو شعراء کا ہجوم تھا۔

بقول ڈاکٹر سید نواب حسین صدر شعبہ اُردو کرائسٹ چرچ کالج کانپور:

''ایک بجے رات کے وقت حضرت جگرؔ مرادآبادی اپنے مخصوص انداز میں تشریف فرما ہوئے اور حاضرین سے جگرؔ جگرؔ کا شور بلند ہوتا ہے۔ حضرت جگرؔ اپنے کیف انگیز نغموں کے ساتھ غزل پڑھتے ہیں۔

جگرؔ یہ مئے ارغوانی نہیں ہے
ارے آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

اسی طرح دوسری اور تیسری غزل پڑھ کر ایک سراسیمگی کے انداز میں اُٹھ جاتے ہیں اور مشاعرہ تھوڑی دیر کے لیے بالکل خاموش ہو جاتا ہے اور کسی غزل گو کو یہ ہمّت نہیں ہوتی کہ وہ اس خاموشی کو توڑے کہ اتنے میں ایک غیر معروف تخلص پکارا جاتا ہے اور مجمع متجسّس نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان نحیف الجثہ شخص اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے اور حضرت جگرؔ کے سامنے آ بیٹھتا ہے اور

اپنی مہین مگر مترنّم آواز میں غزل شروع کر دیتا ہے۔

یہاں سجدہ وہاں سجدہ معاذ اللہ دیوانہ
نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بت خانہ
تری آنکھیں جمالِ یار پر ٹھہریں تو کیا ٹھہریں
نظر اِک رشتۂ شبنم تجلّی آفتابانہ

کلام کیا تھا کہ جادو تھا حضرت جگرؔ مرادآبادی پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور حاضرین پر ایک بے خودی کی کیفیت چھا جاتی ہے۔ کوئی خاموش تو کوئی حیرت زدہ کوئی جذبات سے بے تاب ہو کر واہ واہ پکارنے لگتا ہے۔ اسی طرح دوسری اور تیسری غزل کی فرمائش ہوتی ہے اور ہر غزل پر یہی عالم ہوتا ہے۔ یہ کون تھا؟ یہ حضرت نشورؔ واحدی تھے، جن کی کمال غزل گوئی کا حضرت جگرؔ کو بھی اعتراف کرنا پڑا اور حاضرین نے بھی تسلیم کیا کہ جگرؔ کے بعد بھی کوئی غزل گو پیدا ہو سکتا ہے اور کامیاب ہو سکتا ہے۔''

(ڈاکٹر سید نواب حسین)

۱۹ر مارچ ۱۹۴۰ء صہبائے ہند

اسی طرح پروفیسر ملک زادہ منظور احمد رقم طراز ہیں:

''نشورؔ واحدی صاحب کو پہلی بار میں نے جارج اسلامیہ کالج گورکھپور کے ایک مشاعرہ میں بہت ہی دلکش ترنم کے ساتھ غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا اور اُن کے کلام اور ان کے پڑھنے کے مخصوص انداز سے متاثر ہوا۔ یہ ۱۹۴۷ء کے قبل کی بات ہے۔ مشاعرہ میں اس عہد کے سبھی مشاہیر موجود تھے۔ جگرؔ، احسان دانشؔ، مسعود اختر

جمال، سلامؔ مچھلی شہری، روش صدیقی، مجنوںؔ صاحب اس زمانے میں گورکھپور کے ادبی ڈکٹیٹر تصوّر کیے جاتے تھے اور اگر وہ کسی شعر پر انگلی اُٹھا کر اور آنکھیں نچا کر داد دیتے تھے تو وہ سند بن جاتی تھی۔ میں نے اُسی مشاعرہ میں ان چند شعراء میں جنھیں مجنوںؔ صاحب نے داد دی تھی نشورؔ صاحب کو بھی شامل دیکھا تھا''۔

ضمیمہ خبر نامہ اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، جنوری ۱۹۸۳ء

نشورؔ واحدی صاحب کے ایک ساتھی اور دوست بھیّا محی الدین عیشؔ میرٹھی ساکن لال کرتی میرٹھ کینٹ یوپی اپنی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جب نشورؔ صاحب کا پہلا مجموعہ صہبائے ہند مکمل ہوگیا تو انھوں نے اسے بذریعہ ڈاک اس زمانے کے مشہور ناقد پروفیسر مولانا حامد حسن قادری سینٹ جانس کالج آگرہ کو بھیج دیا۔ جس پر مولانا حامد حسن قادری نے مقدمہ لکھ کر بذریعہ ڈاک نشورؔ صاحب کے پاس بھیج دیا۔ لیکن دونوں ہی حضرات ایک دوسرے سے واقف نہ تھے۔ ایک دن شام کو چار بجے جناب حامد حسن قادری ہوسٹل میں میرے کمرے میں تشریف لائے۔ میں اُن کا شاگرد تھا اور سینٹ جانس کالج آگرہ کا طالب علم تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ جناب حامد حسن قادری نے پوچھا کہ سنا ہے کہ نشورؔ صاحب یہاں کہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم چار طالب علم جو اس کمرہ میں باتوں میں مشغول تھے۔ ان کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے پھر پوچھا کہ نشورؔ صاحب کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم میں سے ایک طالب علم

ان کے سامنے جا کر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ میں ہی نشورؔ واحدی ہوں۔ جناب حامد حسن قادری صاحب عالمِ استعجاب میں غرق ہوگئے اور صاحبزادے نشورؔ صاحب کو عالمِ حیرت میں سر سے پیر تک دیکھتے رہے پھر فرمایا کہ ''صاحبزادے آپ کی کتاب ''صہبائے ہند'' تو آپ سے بہت بڑی ہے''۔ مولانا کے خیال میں ''صہبائے ہند'' جیسی کتاب کا مصنّف کوئی پختہ عمر شخص ہوگا جس نے یہ بے مثال کتاب ''صہبائے ہند'' تخلیق کی ہے۔''

نشورؔ صاحب کی کتاب ''صہبائے ہند'' کی اشاعت سے پہلے ہی مشاعروں میں اُن کی غزلوں نے انھیں ملک گیر شہرت عطا کردی تھی۔ نشورؔ صاحب کے ساتھیوں کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اس مجموعہ کو جلد از جلد شائع ہونا چاہیے، چنانچہ جناب رفیق صہبائی مرحوم، جو ہفت روزہ ''دستور'' اخبار کانپور کے ایڈیٹر و مالک تھے اور چونکہ وہ ایک مشہور کاتب بھی تھے اور اپنے اخبار کی کتابت بھی خود ہی کیا کرتے تھے، نشورؔ واحدی صاحب کی غزل

''تری آنکھیں جمالِ یار پر ٹھہریں تو کیا ٹھہریں
نظر اِک رشتۂ شبنم تجلّی آفتابانہ''

سن کر چیخ اُٹھے، کتابت میں کرتا ہوں طباعت کا اہتمام آپ کریں''۔ (انعام درانی، کراچی روزنامہ جنگ کراچی ۱۸/۱۷ جنوری ۱۹۸۳ء)

آج کل کی طرح اس زمانے میں نہ تو ادارے تھے اور نہ طباعت کی آسانیاں تھیں۔ بیگم نشورؔ واحدی (مومنہ چشتی مرحومہ) نے اپنے کچھ زیور نشورؔ صاحب کو طباعت کی غرض سے پیش کیے جسے نشورؔ صاحب نے بہ مشکل تمام قبول کیے، اس طرح ۱۹۳۹ء میں صہبائے ہند کا پہلا ایڈیشن منشی عظیم اللہ کی نگرانی میں نامی پریس کانپور میں شائع ہوا اور جناب حشمت اللہ منیجر نامی پریس کانپور نے نامی کتب خانہ نئی سڑک کانپور سے جاری کیا۔ یہ

کتاب بانگِ درا سائز پر چھپی۔ قیمت اس کی ڈیڑھ روپیہ غیر مجلد، دو روپیہ مجلد رکھی گئی تھی اور اس کے خاص تقسیم کار میری معلومات کے مطابق جناب نسیم احمد صاحب دانش محل، امین آباد لکھنؤ تھے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن نشورؔ صاحب کی وفات کے چھ سال بعد اور پہلے ایڈیشن کے پچاس سال بعد ۱۹۸۹ء میں نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈا اکبر پور (امبیڈکر نگر) میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے بیگم مومنہ نشورؔ واحدی نے طبع کرائی تو موجودہ دَور کے ناقدین اس مجموعہ سے واقف ہو سکے۔ دوسرے ایڈیشن کے تقسیم کار جناب عابد سہیل صاحب مالک نصرت پبلشر، امین آباد لکھنؤ تھے۔ صہبائے ہند میں ''آفاقیات'' کے نام سے مثنوی صہبائے ہند ہے۔ یہ مثنوی فلسفۂ حیات سے متعلق ہے اس میں ۴۰ سے زیادہ عنوانات ہیں۔ دوسری مثنوی جو اس کتاب میں شامل ہے وہ ماورائیات کے نام سے مثنوی مولانا روم دفتر اوّل تا حکایت وزیر کا ترجمہ ہے۔ یہ دونوں مثنویاں بحر رمل چار رکنی میں ہیں۔ اس کے علاوہ ۴۴ رباعیات/ قطعات اور ۵۳ متفرق اشعار اور ۶۴ غزلیں بھی صہبائے ہند میں شامل ہیں جو انھوں نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان کہی تھیں۔ صہبائے ہند بار اوّل ۱۹۳۹ء میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔ مقدمہ — پروفیسر سید حامد حسن قادری سینٹ جانس کالج، آگرہ
۲۔ مختصر تبصرہ — مولانا معین الدین احمد ندوی
۳۔ رائے — مولانا عبدالماجد دریابادی
۴۔ الفاظ — ڈاکٹر ذاکر حسین
۵۔ تبصرہ — ڈاکٹر سید نواب حسین، صدر شعبۂ اردو کرائسٹ چرچ کالج، کانپور
۶۔ ایڈیٹر زمانہ کے الفاظ۔ دیانرائن نگم

صہبائے ہند کے دوسرے ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں پہلے ایڈیشن کے مضامین کے علاوہ درج ذیل مضامین بھی اس کتاب کی زینت ہیں۔

۱۔ فکرِ نشورؔ — دانشِ آخر الزماں سے اقتباس۔ نشورؔ واحدی
۲۔ پیش لفظ — ایم۔ امیر شرر
۳۔ صہبائے ہند — محمد عثمان عارف نقشبندی سابق گورنر اتر پردیش
۴۔ پیش گفتار — پروفیسر انور صدیقی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۵۔ مثنوی صہبائے ہند — سرسوتی سرن کیف
۶۔ نشورؔ واحدی کی شاعری — پروفیسر نظیر صدیقی، پاکستان
۷۔ چراغِ محبت کا شاعر۔ اقتباس۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد لکھنؤ یونیورسٹی
۸۔ نشورؔ واحدی (اقتباس) — فطرت کاکوری، کراچی
۹۔ تراشے — انعام درانی، روزنامہ جنگ کراچی
۱۰۔ کچھ یادیں۔ — نیاز واحدی

اس کے بعد نشورؔ واحدی صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام ''شورِ نشورؔ'' انجمن وطن، نئی سڑک، کانپور نے جناب اسلم ہندی مرحوم کے زیر نگرانی شائع کیا یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ فلسفۂ وطنیت پر مختلف نظموں وقطعات کا مجموعہ ہے۔ ''شورِ نشورؔ'' میں ۱۲ نظمیں، ۴۸ قطعات، ۷ متفرق اشعار شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں غزلیں نہیں ہیں۔ اس کتاب میں پیش لفظ جناب اسلم ہندی کا ہے۔

نشورؔ واحدی صاحب کا تیسرا مجموعۂ کلام ''آتش ونم'' ۱۹۴۶ء میں ''کتاب محل'' الٰہ آباد نے بہت دلکش گٹ اپ کے ساتھ شائع کیا۔ یہ مجموعہ ۳۷ نظموں اور ۴۲ غزلوں پر مشتمل ہے۔ جو انقلابی اور رومانی خیالات کا آئینہ دار ہے۔ ''آتش ونم'' کا دوسرا ایڈیشن نشورؔ واحدی صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۸۴ء میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، یوپی، لکھنؤ کے مالی اشتراک سے اسرار کریمی پریس الٰہ آباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں پروفیسر احمر لاری گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور کا مقالہ ''نشورؔ واحدی کی شاعری آتش ونم کے

آئینہ میں'' اور نیاز واحدی کا مضمون ''نشورؔ واحدی میرے والد'' شامل ہیں۔ ''آتش ونم'' کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں دیپک پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ آخر کے دونوں ایڈیشن کی ناشر بیگم نشورؔ واحدی ہیں اور مرتّب نیاز واحدی ہیں۔

اس کتاب کے تینوں ایڈیشن میں دیباچہ جناب فراق گورکھپوری کا ہے اور آخرالذکر دونوں ایڈیشن میں پروفیسر احمر لاری کا مقالہ ''نشورؔ واحدی کی شاعری آتش ونم کے آئینہ میں'' اور ''آتش ونم'' کے تیسرے ایڈیشن میں نیاز واحدی کا مضمون ''شخصیت نشورؔ ذہن کے آئینہ خانہ میں'' شامل ہیں۔

پروفیسر احمر لاری ''صہبائے ہند''، اور ''آتش ونم'' کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''صہبائے ہند کی غزلوں میں بیشتر عارفانہ رنگ و آہنگ نمایاں ہے...... زبان و اسلوب کے لحاظ سے بھی آتش ونم پچھلے دونوں مجموعوں سے مختلف ہے۔ 'صہبائے ہند' اور 'شورِ نشورؔ' کی زبان فارسی آمیز اور لہجہ بلند آہنگ ہے مگر آتش ونم کی زبان میں ہندوستانی رنگ نمایاں ہے اور اس کا لہجہ نرم وشیریں ہے۔''

(آتش ونم ایڈیشن دوم وسوم)

ڈاکٹر احمر لاری اپنے اسی مضمون میں جو ''آتش ونم'' میں شامل ہے رقم طراز ہیں:

''حقیقت تو یہ ہے کہ ''آتش ونم'' میں نشورؔ نے مفکّر کا لبادہ اُتار دیا ہے اور وہ ایک نیم رومانی اور نیم حقیقت پسند شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اُن کے بعد کے مجموعے ''فروغِ جام'' ۱۹۵۸ء سوادِ منزل ۱۹۶۸ء ''گل افشانیِ گفتار'' ۱۹۷۷ء دراصل آتش ونم کی ارتقائی شکلیں ہیں اس لحاظ سے ''آتش ونم'' نشورؔ صاحب کا نمائندہ مجموعہ ہے اور اس میں ان کی شخصیت اصل روپ میں جلوہ گر ہوئی

ہے۔''

(آتش ونم ایڈیشن دوم وسوم)

''نشورؔ واحدی کے معاملے میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ شراب و شباب کی شاعری میں کسی ریاض خیرآبادی اور کسی جگر مرادآبادی سے مختلف ہیں یا نہیں اور اُن سے الگ ہٹ کر انھوں نے ان موضوعات کا حق ادا کیا ہے یا نہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ شراب وشباب کی شاعری میں نشورؔ کا رنگ اردو کے دوسرے شاعروں سے قطعاً مختلف ہے اور اس رنگ کے حسن ولطف میں جو انفرادیت ہے وہ آسانی سے محسوس تو کی جاسکتی ہے لیکن آسانی سے بیان نہیں کیا جاسکتی۔''

پروفیسر نظیر صدیقی

رسالہ نیرنگِ خیال خصوصی نمبر ۱۹۸۷ء

اسلام آباد، پاکستان

صہبائے ہند باردوم ۱۹۸۹ء

جناب سرسوتی سرن کیف ''مثنوی صہبائے ہند'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''نشورؔ کے فلسفہ کی اپنی راہیں اپنا شعور اور اپنا لہجہ ہے اور یہی انفرادیت نشورؔ کی فلسفیانہ شاعری کو اہمیت بخشتی ہے ورنہ اقبالؔ کے فلسفہ کو دہرانا تو کوئی فلسفہ نہ ہوتا۔''

(صہبائے ہند باردوم) ۱۹۸۹ء

پروفیسر انور صدیقی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ''صہبائے ہند'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''نشورؔ کی کچھ نظمیں جن میں افکار کی تجسیم ہوتی ہیں۔

اقبالؔ کے اثر کی غماز ہیں۔ یہ اثرات افکار کی سطح پر نہیں لسانی سطح پر ہیں۔ ایک نئی شعری زبان وضع کرنے کا رویّہ انھیں اقبالؔ سے ہم رشتہ کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ فلسفہ وحکمت کی شاعری انھیں بہت دور تک نہیں لے جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ''صہبائے ہند'' کے بعد کے مجموعوں میں نظمیں تو ملتی ہیں مگر ان میں شباب خیز رومانیت ہے، فکر وفلسفہ کی گراں باری نہیں۔ جہاں کہیں فلسفیانہ رویّہ ہے وہاں فکر احساس میں بدل کر جلوہ گر ہوتی ہے اور قارئین کو ایک نئے جہان معنی سے آشنا کرتی ہے۔''

''صہبائے ہند'' باردوم ۱۹۸۹ء

مجموعۂ کلام ''آتش ونم'' کے مقدمہ میں فراق گورکھپوری فرماتے ہیں:

'' نشورؔ واحدی کے کلام کا یہ مجموعہ بڑی خوبصورت شاعری کی مثال ہے۔ یہ نظمیں صرف اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی ہیں.........دورِ حاضر یا گذشتہ ادوار کے کسی مشہور شاعر کا منہ ان نظموں میں نہیں چڑھایا گیا ہے۔ نقالی کی پرچھائیں تک ان نظموں پر نہیں پڑتی۔ نشورؔ کا تخیّل نازک بھی اور صحت بخش بھی ہے ....جو لوگ ان نظموں کو پڑھیں گے وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نشور کے تخیّل اور وجدان میں ایک ایسی گنگناہٹ ہے جس کے تموّج کی لکیریں انفرادی خدوخال رکھتی ہیں۔ نشورؔ کی رفتارِ خیال میں وہ نرم روی ہے اور اس کی آواز پا میں وہ جھنکار ہے جسے ہم فردوس گوش ونظر کہہ سکتے ہیں۔ آواز کی یہ حلاوت اور

گھلاوٹ نشورؔ کی بالکل اپنی چیز ہے جس پر نشورؔ بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔''

''آتش ونم'' کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فراقؔ گورکھپوری لکھتے ہیں کہ:

''نشورؔ کی شاعری کہیں سے نہ بے رنگ ہے نہ بدرنگ۔ وہ چھوٹی باتیں یا اوچھی باتیں نہیں کہتے۔ وہ زندگی کا دامن مضبوطی سے اپنی مٹّھی میں پکڑے ہوئے ہیں اور یہی دامن جب لہراتا ہے تو قوس قزح بن جاتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو بکواس نہیں ہونے دیتے۔ یہ کہ ان کے یہاں ہلکے اشعار نہ ہوں لیکن یہ ہلکے اشعار بھی نشہ کے اُتار کا حسن رکھتے ہیں۔ شاعری میں نشورؔ کی راہ روک دینے والی تکمیل کی بجائے نشورؔ کے لیے راستے کھول دینے والے امکانات نظر آتے ہیں۔ ان کا رنگِ شاعری اس کا پتہ دیتا ہے کہ ابھی اسے اور اُجاگر ہونا ہے۔''

''آتش ونم'' یکم جولائی ۱۹۴۶ء

بزمِ ادب حلیم مسلم کالج کانپور نے ۲۹؍نومبر ۱۹۵۲ء کو حلیم مسلم کالج کانپور میں منعقد ایک یادگار مشاعرہ کی روداد ''جواہر پارے'' کے نام سے آوازِ وطن پریس کانپور سے مارچ ۱۹۵۳ء میں شائع کرائی تھی۔ جس کے مرتّب جناب نشورؔ واحدی تھے۔ اس شعری گلدستے میں مشاعرہ میں شامل شعراء کے کلام کے علاوہ ان کے شعری محاسن پر دلچسپ تبصرے بھی شامل ہیں۔ یہ گلدستہ شعراء کی تصاویر سے بھی مزیّن ہے۔ مشاعرہ میں علامہ اقبال سہیلؔ اعظمی جانشین شبلیؔ، نوحؔ ناروی جانشین داغؔ، جگرؔ مرادآبادی، فراقؔ گورکھپوری، نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، روشؔ صدیقی، حبیب احمد صدیقی آئی۔اے۔ایس اور نشورؔ واحدی وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ نوحؔ ناروی نے فی البدیہہ ایک قطعہ کہہ کر مشاعرہ میں

سنایا تھا۔ جو گلدستہ میں شامل ہے ؎

مشاعرہ میں جو اہلِ شعور آئے ہیں
وہ سب کے سب بخیالِ نشورؔ آئے ہیں
خبر یہ صورتِ طوفاں تمام پھیل گئی
کہ نوحؔ بہتے ہوئے کانپور آئے ہیں

یہ شعری گل دستہ ۶۴ صفحات پر محیط ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ اور سرِ ورق دیدہ زیب ہے۔

جناب نشورؔ واحدی کا چوتھا مجموعۂ کلام 'فروغِ جام' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ یہ دونوں ایڈیشن مولانا شمس علوی کاکوروی مرحوم مالک ادارۂ ''فروغِ اُردو'' امین آباد لکھنؤ کی زیرِ نگرانی شائع ہوئے تھے۔ فروغِ جام کے دوسرے ایڈیشن میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ جناب پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبہ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پیش لفظ اس مجموعہ کی زینت ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور اپنے پیش لفظ کی شروعات اس طرح کرتے ہیں:

''نشورؔ واحدی ہمارے دَور کے ممتاز اور مقبول شاعروں میں ہیں۔ اُن کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مشاعروں میں وہ عارف و عامی ہر ایک سے داد وصول کر چکے ہیں۔ رسالوں میں ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں اور بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی نکالی ہوئی زمینوں میں اُن کے معاصرین طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اُن کے دلکش ترنم اور پُرسوز لہجے کے بہت سے نقّال پیدا ہو گئے ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں

اور نظمیں بھی۔ وہ دونوں کے حسن کے اداشناس ہیں۔ ان کے یہاں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ حسن کی مصوّری بھی ہے اور حالاتِ حاضرہ کی عکاسی بھی۔ عشق کے معاملات بھی ہیں اور مصافِ زیست کی واردات بھی۔ وہ نئے دَور کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں اور ماضی کی بعض لذّتوں اور لطافتوں کو یاد بھی رکھتے ہیں، ان کے یہاں موضوعات میں تجربے ہیں اور روایات کا احساس بھی۔ اُن کے کلام میں اس دَور کا دَرد وکرب بھی ہے اور اس کا نشاط ونغمہ بھی اُن کے چمن میں ہر رنگ کے پھول اور ان کے شیشہ میں ہر طرح کی شراب ہے۔ اپنے طور پر انھوں نے ہمارے دَور کی رُوح کی نمائندگی کی ہے''۔ (فروغِ جام)

مجموعۂ کلام ''فروغِ جام'' میں ۶۶ غزلیں، ۷ نظمیں اور ۱۴ قطعات شامل ہیں۔ ان ۶۶ غزلوں میں سے ۱۲ غزلیں صہبائے ہند سے لی گئی ہیں۔ لیکن فروغِ جام میں نشورؔ واحدی صاحب نے ان ۱۲ غزلوں کو مکمل طور پر نہ لے کر صرف اس کا انتخاب شامل کیا ہے، کہیں کہیں اضافہ بھی کیے ہیں۔

فروغِ جام کے پہلے ایڈیشن ۱۹۵۸ء اور دوسرے ایڈیشن ۱۹۶۹ء کے درمیان انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ (اب نئی دہلی) نے نشورؔ واحدی کے نام سے ۱۹۶۲ء میں غزلوں اور نظموں کا انتخاب شائع کیا تھا، جس کا انتخاب جناب خلیل الرحمٰن اعظمی نے کیا تھا۔

۱۹۶۶ء میں نشورؔ واحدی کی ایک نثری تصنیف ''دانشِ آخرالزماں'' کے نام سے سامنے آئی جو تصوّف وطریقت کے موضوع پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آیا، اس میں ناقدین، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، پروفیسر سید علی رضا حسینی اور ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی کے مقالے بھی شامل ہیں۔ ان دونوں ایڈیشن

کے مرتّب نیاز واحدی ہیں اور پہلے ایڈیشن کے ناشر خود نشورؔ واحدی اور دوسرے ایڈیشن کی ناشر ثروت واحدی بنت نشورؔ واحدی ہیں۔

اس کے بعد نشورؔ واحدی صاحب کی غزلوں کا ایک انتخاب ''سوادِ منزل'' کے نام سے شائع ہوا جسے سنگم بک ڈپو دہلی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ اس مجموعہ کلام کا نام علاّمہ نیازؔ فتح پوری نے تجویز کیا تھا اور غزلوں کا انتخاب خود نشورؔ واحدی صاحب نے کیا تھا۔ نشورؔ صاحب نے ۱۹۶۲ء میں یہ مجموعہ اشاعت کے لیے سنگم بک ڈپو دہلی کو بھیجا تھا۔ اس درمیان نشورؔ صاحب نے ۲۶ غزلیں اور کہیں جو اِس مجموعہ میں ''کچھ مشہور نئی غزلیں'' کے عنوان سے مجموعہ کے آخر میں شامل ہیں۔

مجموعۂ کلام ''سوادِ منزل'' میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۸ء یعنی ''صہبائے ہند''، ''آتش و نم'' اور ''فروغِ جام'' کی غزلوں کا انتخاب شامل ہے اس مجموعہ میں ''صہبائے ہند'' سے ۲۲، ''آتش و نم'' سے ۲۰ اور ''فروغِ جام'' سے ۳۷ اور ۲۶ نئی غزلیں شامل ہیں، اس طرح یہ مجموعہ ۱۱۵ غزلوں پر مشتمل ہے۔

مجموعۂ کلام ''سوادِ منزل'' میں ڈاکٹر محمد حسن کا مقالہ ''البیلا غزل گو'' کے عنوان سے شامل ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے نشورؔ کو شاعرِ شبابیات بھی کہا ہے۔ اپنے مقالہ کے آخر میں پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

> غالبؔ نے کہا تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی ہے اور معنی آفرینی کی جان نغز گوئی ہے۔ نشورؔ کی اچھی غزلوں میں نغز گوئی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی غزلیں سجیلی ہیں، بناوٹی نہیں ہیں، ان میں آرائش ہے مگر تصنع نہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی شاعری کی آبیاری ''خونِ جگر'' سے کی ہے۔ اسی لیے ان کی کیاریاں شگفتگی اور شادابی سے لہلہا رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صاحبانِ ذوق اس مجموعہ

میں دعوتِ فکر و نظر کا کافی ذخیرہ پائیں گے اور قدم قدم پر ان غزلوں کا البیلا پن ان کی دامن کشاں ہوگی۔ ع

''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست''

رابعہ منزل، بدر باغ علی گڑھ — محمد حسن

۱۸؍فروری ۱۹۶۲ء

مجموعۂ کلام ''سوادِ منزل'' کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ محترمہ شاہین فاطمہ اہلیہ امتیاز واحدی کے زیرِ اہتمام منظرِ عام پر آیا۔ اس کی ناشر ثروت واحدی بنت نشورؔ واحدی اور مرتّب راقم الحروف نیاز واحدی ہیں۔ اس کی کمپوزنگ جناب ایس۔ ایم۔ نورالحسن صاحب اور جناب ایس۔ ایم۔ معراج الحسن صاحب یونک کمپیوٹر سینٹر، ندوہ روڈ لکھنؤ نے کی اور طباعت ڈزائننگ اور دلکش انداز میں شائع کرنے کا کام جناب فیصل وقار، ایس۔ ایف۔ گرافکس کچہری روڈ لکھنؤ نے بہ حسن و خوبی انجام دیا۔ مجموعۂ کلام ''سوادِ منزل'' کے اس دوسرے ایڈیشن میں پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن کا مقالہ ''البیلا غزل گو'' کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

۱۔	چراغِ محبت کا شاعر	پروفیسر ملک زادہ منظور احمد
۲۔	نشورؔ واحدی کا پیرایۂ تغزل	چودھری علی مبارک عثمانی، سترکھ بارہ بنکی
۳۔	نشورؔ واحدی کی شاعرانہ عظمت	شفاعت علی صدیقی لکھنؤ
۴۔	چپ رہ کے وہ اندازِ سخن ہم نے بنایا	ڈاکٹر رضوان احمد پٹنہ
۵۔	نشورؔ واحدی کا نسبی شجرہ اور حیاتِ نشورؔ	نیاز واحدی

مجموعۂ کلام ''سوادِ منزل'' کے بعد ۱۹۷۷ء میں ''گل افشانیِ گفتار'' شائع ہوئی۔ اسے مکتبہ جامعہ نئی آواز، جامعہ نگر نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔ اس مجموعہ میں ۶۳ غزلیں شامل ہیں جو کہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۷ء کے درمیان کہی گئی تھیں۔ اس مجموعہ میں دو غزلوں

''ایک رات آتی ہے ایک رات جاتی ہے'' اور ''اے گوشہ نشینانِ زیارت گہہ تہذیب'' کے صرف تین تین اشعار ہی موجود ہیں مکمل غزلیں مجموعۂ کلام ''اشکِ چکاں سے عصر رواں تک'' میں شامل ہیں۔ اس لیے ''گل افشانیٔ گفتار'' میں ان غزلوں کو فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ''گل افشانیٔ گفتار'' میں شامل ۶۳ غزلوں میں سے صرف ۶۱ غزلیں فہرست غزلیات میں شامل ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں آل انڈیا میرؔ اکادمی لکھنؤ کی جانب سے نشورؔ واحدی کی غزلوں کا انتخابی مجموعہ جناب مقبول احمد لاری نے ''سلکِ شبنم'' کے نام سے شائع کیا، اس مجموعہ میں شامل غزلوں کا انتخاب میرے علم کے مطابق جناب مقبول احمد لاری، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور پروفیسر احمر لاری گورکھپور یونیورسٹی نے کیا تھا اور اس کی رسمِ اجرا جناب پروفیسر شبیہہ الحسن نونہروی نے انجام دی تھی۔ اس مجموعہ میں پیش لفظ جناب مقبول احمد لاری کا ہے اور اس میں پچاس منتخب غزلیں شامل ہیں۔

نشورؔ واحدی صاحب نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۹ء تک ''تاریخ فلسفۂ خودی ایشیا'' اور ''ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقا'' نامی کتابوں کی تخلیق و تزئین میں زیادہ وقت دیا۔ ''تاریخ فلسفۂ خودی ایشیا'' نشورؔ واحدی صاحب نے ۱۹۷۹ء میں لیتھو برقی پریس، نئی سڑک کانپور سے جشن نشورؔ واحدی کمیٹی کے مالی اشتراک سے خود شائع کرائی۔ ''ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقا'' ان کی وفات کے آٹھ سال بعد امتیاز واحدی کے زیر اہتمام بیگم مومنہ نشورؔ واحدی نے اردو اکادمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈا اکبر پور (امبیڈکر نگر) سے ۱۹۹۳ء میں شائع کرایا جس کے مرتّب نیاز واحدی ہیں۔ کتاب ''ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقا'' میں پروفیسر نثار احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی دہلی کا تحریر کردہ پیش لفظ، جناب شجاعت علی سندیلوی کا مقالہ ''نشورؔ واحدی بحیثیت نثر نگار''، جناب فرمان فتح پوری، کراچی کا مضمون ''نشورؔ واحدی۔ خودی کا ممتاز اسکالر اور مفسّر'' شامل ہے۔

کتاب ''ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء'' میں ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نشورؔ واحدی کی نثر نگاری اور شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

> ''نشورؔ کا کلام جلال و جمال کا پیکر ہے اس میں حسن و عشق کے رموز بھی بیان کیے گئے ہیں اور زندگی کے حقائق کی ترجمانی بھی کی گئی ہے۔ ترشے ترشائے الفاظ اشعار میں نگینوں کی طرح جڑے ہیں۔ اندازِ بیان میں ندرت اور تشبیہات و استعارات میں جدت ہے۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ بہت گہرا ہے۔''

۱۹۹۲ء میں بچوں کی نظمیں ''پھولوں کی انجمن'' کے نام سے جناب سہیل صدیقی مرحوم ریسرچ اسکالر نے سفینہ پبلی کیشنز بھوپال۔ ایم۔ پی سے شائع کرایا تھا۔ اس کتاب میں جناب سہیل صدیقی مرحوم کا ایک مقالہ ''نشورؔ واحدی کی بچوں کی شاعری'' شامل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹ نظموں پر مشتمل ہے۔

جناب شفاعت علی صدیقی اُردو پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ ادیب و صحافی نے نشورؔ واحدی صاحب کے متفرق کلام ۷ نعتیں، ۱۲ قومی و وطنی نظمیں، ۶ قطعات، ۱۰ غزلیں، ۱۶ شخصی مرثیہ، ۸ سہرے ایک رخصتی اور ایک سالگرہ پر نظم، پر مشتمل کلام کو یکجا کر کے مرتّب کیا تھا جسے ''عزمِ محکم'' کے نام سے بیگم مومنہ نشورؔ واحدی نے لکھنؤ پبلیشنگ ہاؤس، لکھنؤ کینٹ سے شائع کرایا تھا۔

جناب شفاعت علی صدیقی اپنے مضمون ابتدائیہ میں رقم طراز ہیں:

> ''نشورؔ صاحب جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ اُن کا شمار ان چند صاحبِ طرز نثر نگاروں اور باکمال شاعروں میں کیا جاتا ہے جنھیں زمانہ صدیوں میں پیدا کرتا ہے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر، تشکیل، پختگی میں ان کے علمی و ادبی اور

مذہبی ماحول نیز ان کی خداداد ذہانت وصلاحیت کا بڑا حصّہ ہے‘‘۔

’’عزمِ محکم‘‘

جناب شفاعت علی صدیقی کے مضمون ’’ابتدائیہ‘‘ کے علاوہ اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل مضامین بھی شامل ہیں۔

۱۔	نشورؔ واحدی ایک شفیق استاد اور مایہ ناز غزل گو	سرفراز احمد علوی فطرت کاکوروی کراچی
۲۔	عہدِ جدید کی ایک آواز نشورؔ واحدی	ڈاکٹر نفیس بانو
۳۔	نشورؔ واحدی کی انفرادیت	ڈاکٹر طارق حسن، صحافی لکھنؤ
۴۔	نشورؔ واحدی کی گھریلو زندگی	رخسانہ مظہر اور بیگم مومنہ نشورؔ واحدی کی بات چیت
۵۔	نشورؔ کی نعتیہ شاعری	پروفیسر عتیق۔اے۔صدیقی مرحوم، صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مجموعۂ ’’گل افشانیِ گفتار‘‘ (۱۹۷۷ء) کے شائع ہونے کے بعد بھی کچھ غزلیں ایسی رہ گئیں جو نشورؔ صاحب کے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہ ہوسکیں حالانکہ ان غزلوں کو نشورؔ صاحب نے ٹی۔وی اور ریڈیو پر خود پڑھی تھیں اور رسالوں میں شائع بھی ہوئی تھیں، نشورؔ صاحب کو بھی ان غزلوں کو کسی مجموعہ میں شامل نہ ہونے کا احساس تھا، چنانچہ انھوں نے اپنی بیاض میں تحریر کیا ہے کہ:

’’جن غزلوں پر صلیبی نشان ہے اور اس کے بعد کی کہی گئی غزلیں ’’اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک‘‘ میں شامل ہوں گی‘‘۔

’’اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک‘‘

شعری مجموعہ ’’اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک‘‘ میں کل ۵۵ غزلیں ہیں جو

۱۹۴۲ء سے ۱۹۸۲ء تک کے عرصہ میں وقتاً فوقتاً کہی گئی تھیں۔ ان غزلوں کے نیچے تاریخ درج کر دی گئی ہے تاکہ ان غزلوں کے کہے جانے کے ادوار کا پتہ چل سکے۔ یہ مجموعہ ۲۰۰۰ء میں بیگم نشورؔ واحدی (مومنہ چشتی) نے یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس، لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع کرایا تھا۔ اس کے مرتّب نیاز واحدی ہیں۔ مجموعۂ کلام ’’اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک‘‘ میں بارہ مضامین شامل ہیں۔

۱۔	تبرکات	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، لکھنؤ
۲۔	نشورؔ۔ تغزل کی سنہری آواز	ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی
۳۔	نشورؔ واحدی ایک منفرد غزل گو	ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی، بھوپال
۴۔	نشورؔ واحدی اردو غزل کا ایک منفرد فنکار	ڈاکٹر سید عبدالباری
۵۔	جلوۂ نشورؔ	پروفیسر سید ابوالحسنات، کانپور
۶۔	شعر نشورؔ آفاقیت سے ماورائیت تک	شمس تبریز خاں، لکھنؤ یونیورسٹی
۷۔	نشورؔ واحدی ایک مطالعہ	محمد امیر شرر
۸۔	نشورؔ واحدی غزل کے نغز گو شاعر	پیام فتحپوری مرحوم، کانپور
۹۔	شاعرِ شیریں نوا	نامی انصاری، کانپور
۱۰۔	نشورؔ واحدی کی شاعرانہ شخصیت	کوثر جائسی مرحوم کانپور

حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اپنے پیش لفظ تبرکات کے تحت لکھتے ہیں:

نشورؔ واحدی صاحب اپنے عہد کے عظیم اور مایہ ناز شاعروں میں گزرے ہیں، ان کی شاعری کا رنگ وآہنگ، حسن و عشق کی خوش بیانی، زندگی کے راحت وغم کی ترجمانی، تصوّف و فکرِ بلند کا اظہار، پُر اثر انداز میں، ان کے شعری پیکر میں جھلکتا

نظر آتا ہے۔انھوں نے غزل کو ایک نیا رنگ عطا کیا اور اس راہ میں اپنی ایک منفرد جگہ بنائی۔

''مجموعہ کلام اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک''

ہندی رسم الخط میں بھی ۱۹۶۰ء میں اُردو ہندی ساہتیہ سدن کانپور نے ایک انتخاب ''نشورؔ واحدی کی سروسریشٹھ غزلیں'' شائع کیا تھا۔ ۲۰۰۳ء میں بیگم نشورؔ واحدی نے ہندی رسم الخط میں نہایت خوبصورت گٹ اَپ کے ساتھ ایک مجموعہ نشورؔ واحدی شخصیت، عکس اور شاعری کے نام سے یونائیٹیڈ بلاک پرنٹرس لکھنؤ سے شائع کرایا تھا، اس کا دوسرا ایڈیشن رجت پرکاشن نے وہلرز بک سیلرز کے لیے اپنی سیریز ''اُردو ادب کے امر شاعر'' کے تحت ''نشورؔ واحدی کی سروسریشٹھ شاعری'' ۲۰۰۹ء میں میرٹھ سے شائع کی ہے۔ پہلے ایڈیشن کے مرتّب نیاز واحدی ہیں۔اس مجموعہ میں ۷۵ غزلیں اور سات نظمیں شامل ہیں۔

نشورؔ واحدی کے نثری کارناموں میں فارسی زبان سے اردو زبان میں ایک ترجمہ بھی ہے۔شہیدِ ملّت سلطان ٹیپو شہید کے پوتے شاہزادہ کیقباد کی فرمائش سے فارسی زبان میں مرتب کی ہوئی ''تواریخ بنگالہ'' از ابوالمعالی محمد عبدالروف المتخلص بہ وحید بنگالی مغفور سنہ تکمیل ۱۲۹۶ھ بمطابق ۱۸۷۷ء کا اردو ترجمہ نشورؔ واحدی صاحب نے جناب ایس۔ایم۔بشیر بار ایٹ لا، کانپور کی فرمائش سے ۱۹۵۵ء میں کیا تھا جو کافی تاخیر سے نیاز واحدی نے مرتّب کر کے ۲۰۰۸ء میں ایس۔ایف گرافکس کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔اس کتاب میں ہندوؤں کے دورِ حکومت سے لے کر نواب علی وردی خاں کے عہد تک کے حالات درج ہیں۔اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین بھی شامل ہیں۔

۱۔ نشورؔ واحدی بحیثیت نثر نگار و مترجم — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

۲۔ تواریخ بنگالہ اور نشورؔ واحدی بحیثیت مترجم — ڈاکٹر محمد ارشد خاں

۳۔ حیاتِ نشورؔ اور ان کا خاندانی پس منظر — نیاز واحدی

نشورؔ واحدی صاحب نے اپنی زندگی میں متعدد مضامین بھی لکھے۔اس سلسلہ میں جو ریکارڈ حاصل ہو سکا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

فانیؔ کے کلام میں لکھنوی آرٹ کا کمال

فانیؔ کا نظریہ فنا اور اس کی صوفیانہ حیثیت

فانیؔ اور فلسفہ جبر

یہ تینوں مضامین بالترتیب ماہنامہ ''ساقی'' دہلی، ماہنامہ ''تصویر'' رام پور، یو پی، اور ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوئے۔ یہ تینوں مضامین مارچ اور اپریل ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئے تھے۔

جگرؔ مرادآبادی سے ملاقات کا لمحۂ اوّل، ماہنامہ ''آج کل''، نئی دہلی، جنوری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ جناب ندرتؔ کانپوری اور ان کا کلام (مجموعہ موج رنگ، از ندرتؔ کانپوری ۱۹۶۹ء) ''شاعر کا قدم منزل صدق وصفا کی طرف'' (عیشؔ میرٹھی کا مجموعۂ کلام دلکش) گوہرؔ کی غزلوں پر ایک نگاہ (گوہرؔ مرادآبادی کے مجموعۂ کلام آبشار ۱۹۷۱ء) پیامؔ فتح پوری کے کلام ''بادہ شبانہ'' پر مقدمہ (۱۶؍دسمبر ۱۹۶۸ء) یہ پانچ مضامین ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء کے درمیان لکھے گئے۔اس کے علاوہ جگرؔ کے تغزل میں اتار چڑھاؤ، میر انیسؔ کے انفرادی رجحانات ''فراقؔ صاحب کے ساتھ سفر وحضر میں'' یہ تینوں مضامین نشورؔ صاحب کی وفات کے بعد راشٹریہ سماچار فیچرس نٹ ورک لکھنؤ، روزنامہ ''قومی آواز'' لکھنؤ اور ماہنامہ ''نیا دور'' فراقؔ نمبر حصّہ اوّل میں شائع ہوئے۔غیر مطبوعہ مضامین میں ''اردو غزل'' اور ''مظہر امام کی غزل'' ہیں۔

نشورؔ واحدی صاحب نے شعراء کرام کے شعری مجموعوں پر لاتعداد تبصرہ لکھے لیکن اس کی کاپی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے جو چند تبصرے مل سکے، ان کی تعداد دس ہے۔ جوشاد عارفی، وسیم بریلوی، پیام فتح پوری، عارف سیتاپوری، واجد سحری، سوز سکندر پوری، نسیم شاہجہاں پوری کے مجموعہ کلام سے حاصل کیے گئے۔تین تبصرے ایک گلدستہ کئی رنگ میں

ہے۔اس میں پاکستان کے شعرا محبوب خزاں، کا مجموعۂ کلام ''اکیلی بستیاں''، محبّ عارفی کا مجموعہ ''گل آگہی''، اور قمر جمیل کا مجموعہ ''خواب نما'' میں شامل کلام پر نشورؔ واحدی صاحب نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ یہ تینوں تبصرے اپنی عمر کے آخری دور میں لکھے تھے مگر اسے وہ صاحبِ فرمائش کو غالباً بھیج نہیں سکے۔ جناب ڈاکٹر محمد ارشد اعظمی مصنّف ''نشورؔ واحدی شخصیت اور فن'' (۱۹۹۸ء) نے مندرجہ بالا ۱۳ تنقیدی و تاثراتی مضامین، ۱۰ تبصروں کو یکجا کر کے ''رمزِ معانی'' کے نام سے نشورؔ واحدی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۲۰۰۸ء میں کیف گرافکس اینڈ پرنٹرس کانپور سے جناب عشرت ظفر صاحب کی نگرانی میں شائع کرایا۔

اس کتاب میں ڈاکٹر ارشد اعظمی کے پیش لفظ ''جرأتِ اظہار اور حرفِ تشکّر'' کے علاوہ مشہور ناقدین پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی مرحوم، سید علی رضا حسینی کانپور اور جناب عشرت ظفر کانپور کے مضامین بھی شامل ہیں، جس سے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

۱۔ نشورؔ واحدی صاحب کا کل نثری سرمایہ:-

۱۔ دانش آخرالزماں (۱۹۶۶ء اور ۲۰۰۸ء)

۲۔ تاریخ فلسفہ خودی، ایشیائی افکار و نظریات کی تاریخ میں فلسفۂ خودی کا سراغ، (۱۹۷۹ء) اور ۲۰۱۰ء

۳۔ ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء (ہندوستان میں فلسفۂ انا ویدک عہد کے قبل سے علامہ اقبالؔ تک ۱۹۹۳ء)

۴۔ رمزِ معانی (نشورؔ واحدی کے تنقیدی و تاثراتی مضامین ۲۰۰۸ء)

۵۔ تواریخ بنگالہ (فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ ۲۰۰۸ء)

۶۔ جواہر پارے۔ مرتبہ نشورؔ واحدی، جلسہ کانپور کے یادگار مشاعرہ کی روداد ۱۹۵۳ء میں محفوظ ہے۔

۲۔ نظمیں اور قطعات:-

نشورؔ واحدی صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز غزلوں اور نظموں سے ایک ساتھ ہی کیا۔ مجموعۂ کلام ''صہبائے ہند'' میں دو مثنویاں ملتی ہیں۔ پہلی مثنوی ''آفاقیات'' کے تحت ''مثنوی صہبائے ہند'' ہے جو فلسفۂ حیات سے متعلق ہے۔ دوسری مثنوی ''ماورائیات'' کے تحت مثنوی مولانا روم دفتر اوّل تا حکایت وزیر کا منظوم ترجمہ۔ اس میں ۴۴ قطعات بھی ہیں۔ مجموعۂ کلام ''شورِ نشورؔ'' میں ۱۲ نظمیں اور ۴۸ قطعات ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف سرخیوں کے تحت سات اشعار بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ مجموعۂ کلام ''آتش و نم'' میں ۳۷ نظمیں شامل ہیں۔

مجموعۂ کلام ''فروغِ جام'' میں ۷ نظمیں اور ۱۴ قطعات ہیں۔ مجموعۂ کلام ''عزمِ محکم'' میں ۷ نعتیں، ۱۲ قومی و وطنی نظمیں، ۱۶ شخصی مرثیے، ۸ سہرے، ایک رخصتی پر نظم اور ایک سالگرہ پر نظم شامل ہے اور ۶ قطعات بھی اس کتاب کی زینت ہیں، اس طرح مجموعۂ کلام ''عزمِ محکم'' میں کل ۴۵ نظمیں ہوتی ہیں۔

پھولوں کی انجمن، نشورؔ واحدی کی بچوں کی شاعری، ۱۹ نظموں پر مشتمل ہے۔

ایک نظم خدائے سخن جو میر انیسؔ کی شاعرانہ عظمت پر ہے اور ''نیا دور'' لکھنؤ کے انیسؔ نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ نشورؔ واحدی کے کسی دیوان میں شامل نہ ہو سکی۔ اس نظم کو شامل کر کے مندرجہ بالا چھے شعری مجموعوں کی نظموں کو ملا کر نشورؔ واحدی کی نظموں کی کل تعداد ۱۳۱ ہوتی ہے اور قطعات کی تعداد ۱۱۲ ہے۔ مجموعۂ کلام ''صہبائے ہند'' سے ایک قطعہ اور مجموعۂ کلام شورِ نشورؔ سے تین قطعات مجموعۂ کلام ''فروغِ جام'' میں شامل ہیں اور مجموعۂ کلام ''عزمِ محکم'' میں شامل ۶ قطعات میں سے ۴ ''شورِ نشورؔ'' سے ماخوذ ہیں۔ اس طرح ۸ قطعات نکال کر دیکھا جائے تو قطعات کی تعداد کل ۱۰۴ رہ جاتی ہے۔

۳۔ متفرق اشعار:۔

نشور واحدی صاحب کے تین مجموعہ کلام میں چند متفرق اشعار بھی ملتے ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔	صہبائے ہند	۵۳
۲۔	شورِ نشور	۷
۳	گل افشانیِ گفتار	۲

کل متفرق اشعار ۶۲ ہوتے ہیں۔

۴۔ غزلیں:۔

نشور واحدی صاحب کے سات مجموعۂ کلام (جن میں غزلیں ہیں) ''صہبائے ہند'' ۶۴ غزلیں، ''آتش و نم'' ۴۲ غزلیں، ''فروغِ جام'' ۶۶ غزلیں (۵۴ نئی اور ۱۲ منتخب) ''سوادِ منزل'' ۲۶ نئی غزلیں، ''گل افشانیِ گفتار'' ۶۱ غزلیں، ''عزمِ محکم'' سے ایک غزل بہ زبان فارسی، (یہ غزل صرف مجموعۂ کلام ''عزمِ محکم'' میں شامل ہے) ''اشکِ چکاں سے عصرِ رواں تک'' میں ۵۵ غزلیں ہیں جن کی کل تعداد ۳۱۵ غزلیں ہوتی ہیں۔ اگر ''فروغِ جام'' میں شامل ۱۲ منتخب غزلوں کو نکال کر دیکھا جائے تو کل ۳۰۳ غزلیں ہوتی ہیں۔ ان ۱۲ منتخب غزلوں کے الفاظ میں بھی کہیں کہیں ردوبدل ہوا ہے نیز کچھ اشعار کے اضافے بھی ہوئے ہیں۔ اگر اِن غزلوں کو بھی نئی غزلوں میں شامل کرلیا جائے تو ۳۱۵ غزلیں ہوتی ہیں۔

دورانِ نظرِ ثانی نشور واحدی صاحب کی بیاض میں دو غیر مطبوعہ غزلیں۔

۱۔ روشنی کو بھی اندھیروں سے نکلتے نہ بنے

۲۔ شبِ تیرہ ہے تو آنسو پس تیرگی بہالوں

ملیں جسے ان کے آخری مجموعۂ کلام ''اشک چکاں سے عصر رواں تک'' میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ اب ان دونوں غزلوں کو کلیات نشور واحدی حصّہ غزلیات کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اس طرح نشور واحدی صاحب کا کل سرمایہ ۳۱۷ غزلیں ہو جاتی ہیں۔

نیاز واحدی (مرتّب)

408/3 نیو حیدر آباد، لکھنؤ

صہبائے ہند

۱۹۳۰ء

سے

۱۹۴۰ء

تک

(۱)

نَفَس نَفَس پہ مجھے یاد آئے جاتے ہیں
تمام رُوح تخیّل پہ چھائے جاتے ہیں

ہم ان کا ذوقِ محبّت چُھپائے جاتے ہیں
مگر یہ اَبرُ جو ساون کے آئے جاتے ہیں

گرائے جاتے ہیں پردے اُٹھائے جاتے ہیں
ابھی سے نامِ خدا حشر ڈھائے جاتے ہیں

نظر نظر پہ مِری مسکرائے جاتے ہیں
نظر جھکاکے نگاہیں مِلائے جاتے ہیں

یہی سماں تھا کسی کی وداعِ آخِر کا
ستارہائے سحر جھلملائے جاتے ہیں

زمانہ یاد کرے یا صبا کرے خاموش
ہم اِک چراغِ محبّت جلائے جاتے ہیں

نشوؔر آپ کے اشعارِ درد کیا کہنا
کسی کی بزمِ محبّت میں گائے جاتے ہیں

﴿۲﴾

نہ کرے یاد زمانہ نہ سہی
ایک میرا یہ فسانہ نہ سہی

دل میں آجایئے جلوے لے کر
میں تو ہوں آئنہ خانہ نہ سہی

نالۂ درد سلامت میرا
نغمہ نایاب ترانہ نہ سہی

حُسن میں ایک ہے تو دُنیا میں
عشق میں کوئی یگانہ نہ سہی

اِک نظر ڈال جہاں پڑجائے
پھینک دے تیر نشانہ نہ سہی

ان کے اندازِ تغافل پہ نشورؔ
اِک زمانے کا زمانہ نہ سہی

﴿۳﴾

عروجِ ماہ میں جب وقتِ شام ہوتا ہے
خیال آپ کا محشر خرَام ہوتا ہے

محبّتوں میں یہ رَنگِ کلام ہوتا ہے
ہر اِک نگاہ میں دل کا پیام ہوتا ہے

کسی کی یاد میں پھر دورِ جام ہوتا ہے
خراب میکدہ پھر تازہ کام ہوتا ہے

شراب حُسن سے مستی ٹپکنے لگتی ہے
عجیب رنگ ترا، صبح و شام ہوتا ہے

نگاہ چار ہوئی اور جھک گئیں نظریں
شباب مانعِ طرزِ سَلام ہوتا ہے

کسی کی یاد مُصیبَت کی یاد ہوتی ہے
کسی کا نام قیامت کا نام ہوتا ہے

وفورِ شوق تو دامن پکڑ ہی لیتا ہے
اگر خموش لبِ احترام ہوتا ہے

کسی کو آتشِ ہجراں سے پھونکنے والے
بہار جاتی ہے ساون تمام ہوتا ہے

ہر ایک شعر پہ گویا پھڑک اُٹھی محفل
نشورؔ آپ کا بھی کیا کلام ہوتا ہے

﴿۴﴾

ہنسنے والے! دل کسی کا توڑ کر
فائدہ؟ جام تمنّا توڑ کر

از سرِ نو ہم بنائیں گے صلیب
آپ کی زلف چلیپا توڑ کر

ایک کردے پھر شراب حُسن و عشق
کاسۂ مجنوں و لیلیٰ توڑ کر

پھینک مت اپنی جبینِ حُسن سے
میری قسمت کا ستارا توڑ کر

نرم و نازک ایک اندازِ نگاہ
ہے کلیجے میں کلیجا توڑ کر

یاد ہے، او ناز فرما! یاد ہے
پھینکنا پھولوں کی مالا توڑ کر

اِضطراب شوق میں آیا نکل
قطرۂ ایجادِ دَریا توڑ کر

دیکھتا رہ جائے گا وَاعظ نشورؔ
ہم نکل جائیں گے تقویٰ توڑ کر

﴿۵﴾

غزل مسلسل

مہِ ساون میں جوں جوں رودِ گنگا بڑھتی جاتی ہے
تمنّا آپ کی جانِ تمنّا بڑھتی جاتی ہے

گھٹاؤں میں بہارِ آرزو جب تم نہیں ہوتے
بلائے غم بہ گلبانگِ پپیہا بڑھتی جاتی ہے

ہوا برسات کی نغمے جنوں کے چھیڑ دیتی ہے
گھٹا کے ساتھ یادِ حُسن لیلیٰ بڑھتی جاتی ہے

وہ ہریالی وہ صحرا وہ فروغِ جلوۂ گلشن
بہارِ سبز میں برقِ تجلّیٰ بڑھتی جاتی ہے

وہ جھولے پر کوئی نظّارۂ جنباں معاذ اللہ
تڑپ جاتا ہے دل چشم تماشا بڑھتی جاتی ہے

ہوا برسات کی صحرا بہ صحرا ہوتی آتی ہے
گھٹا سیلاب کی دریا بہ دریا بڑھتی جاتی ہے

چڑھے ساون وہ اللہ رے کسی کا حُسن روز افزوں
ہر اک چھینٹے پہ آب روئے زیبا بڑھتی جاتی ہے

شروعاتِ جوانی میں ہر اِک لحظہ ہر اِک لمحہ
قیامت خیزیٔ حُسن و سراپا بڑھتی جاتی ہے

اُدھر تھمتا نہیں پانی اِدھر رُکتے نہیں مضموں
نشورؔ واحدی کی طبعِ والا بڑھتی جاتی ہے

﴿۶﴾

ہم شوخیِ اندازِ جفا دیکھ رہے ہیں
ہاتھوں میں قیامت کی حنا دیکھ رہے ہیں

دل دیکھ رہے ہیں کہ خدا دیکھ رہے ہیں
ہم حُسن میں کیا جانئے کیا دیکھ رہے ہیں

پردے میں اُنھیں پردہ کشا دیکھ رہے ہیں
پھر شوق باندازِ حیا دیکھ رہے ہیں

ہم اور کوئی مستِ خرابات جوانی
توبہ ہے کہ ایمان گیا دیکھ رہے ہیں

ہر رنگ میں ہم ڈھونڈ رہے ہیں کوئی منزل
ہر راہ میں نقشِ کفِ پا دیکھ رہے ہیں

خلوت میں نشورؔ آپ کو تسبیح مُبارک
ہم باغ میں ہیں اور گھٹا دیکھ رہے ہیں

(۷)

میں بھول گیا تجھ میں محرابِ خدا خانہ
اے سجدہ گہہ عالم اے اَبروئے جانانہ

وہ جلوۂ مستانہ وہ زلفِ پسِ شانہ
برباد کنِ کعبہ غارت گرِ بت خانہ

پیمانہ کہاں تک ہے اے ساقی میخانہ
ہم نے تو نہیں پائی اب تک تہِ پیمانہ

پہنچا دیا ساقی نے پایان حقیقت تک
پیمانہ بہ پیمانہ میخانہ بہ میخانہ

اس غزل کا تیسرا پانچواں اور چھٹا شعر نشورؔ صاحب نے فروغ جام سے نکال دیا ہے
اور ۶ نئے اشعار کا اضافہ کیا ہے۔

تو حسن کے جلوؤں پر تھا خنداں بہ زیرِ لب
اب تھام ذرا دل کو اے زاہدِ فرزانہ

تبدیل ہوا میری گلگشت فضا میری
اِک عشق کا افسانہ اِک حسن کا کاشانہ

اِک وجد ٹپکتا ہے ہر لفظِ محبت سے
ہے شعرِ نشورؔ آخر کس حُسن کا افسانہ

﴿۸﴾

غزل مسلسل

وہ حسن و عشق میں جب انتخاب ہوتا ہے
نگاہ حشر قیامت شباب ہوتا ہے

ہر ایک گوشۂ دل آفتاب ہوتا ہے
ہر ایک ذرّۂ تن اضطراب ہوتا ہے

وہ وقت اور بھی جانِ شباب ہوتا ہے
جب ایک مست ادا بے نقاب ہوتا ہے

وہ دستِ شوق و آغوش جلوۂ رنگیں
عجیب منظر جام و شراب ہوتا ہے

وہ کیف وصل وہ شرمِ لقائے تنہائی
کوئی خموش کوئی نیم خواب ہوتا ہے

جھکی جھکی ہوئی نظریں کھنچے کھنچے ہوئے خود
اِک التفات بصد اجتناب ہوتا ہے

خیالِ حسن میں بیداریِ نگاہ کہاں
دماغ مستِ تجلّیِ خواب ہوتا ہے

کبھی کچھ اور تمنّائے شوق ہوتی ہے
تمام نقشِ محبّت برآب ہوتا ہے

خطائے شوق پہ جب باز پرس ہوتی ہے
سوال کچھ ہو محبّت جواب ہوتا ہے

تبسّمات کے سامانِ انبساط کے بعد
کبھی فراق بچشم پُر آب ہوتا ہے

نشورؔ رسمِ تغزّل ابھی رہے جاری
کہ ہوتے ہوتے کوئی انقلاب ہوتا ہے

﴿۹﴾

مل کے آیا ہوں یاد تازی ہے
میں ہوں اور اُن کی دلنوازی ہے

پھر تخیّل میں حسن سازی ہے
پھر تصوّر میں عشق بازی ہے

عشق اور اس کی قدر دانی پر
حسن اور اس کی بیش نازی ہے

لطف آتا ہے اس نیاز میں کچھ
ورنہ دل خود ہی بے نیازی ہے

ہار جانا نشورؔ ہستی کا
نام اسی کا تو پاکبازی ہے

﴿۱۰﴾

اِدھر بھی ذرا او نظر کرنے والے
ہماری مہمّات سر کرنے والے

اُدھر کر رہے ہیں نظر نیچی نیچی
اِدھر ٹکڑے ٹکڑے جگر کرنے والے

خرامِ نزاکت کے انداز سارے
زمانہ اِدھر کا اُدھر کرنے والے

حجابوں حجابوں میں اللہ توبہ !!
نظارے ہوئے بے خبر کرنے والے

انھیں کیا خبر ہے شبِ ہجر کیا ہے
اسے جانتے ہیں سحر کرنے والے

مٹا دے اسی طرح تخمِ محبّت
نہالِ وفا بے ثمر کرنے والے

رہا کس کی فرزانگی کا تکبّر
جنوں میں ہمیں مشتہر کرنے والے

ہیں یہ نالہائے نشورؔ شکستہ
نہیں کرتے کرتے اثر کرنے والے

﴿۱۱﴾

نشّۂ مے سے نہ سمجھے کوئی مدہوش مجھے
رکھتی بدمست ہے کیفیت آغوش مجھے

ناز بردارِ تمنّا کو کہاں فخر نصیب
زُلف کا بار عنایت تو کرے دوش مجھے

منہ چھپالے تو مرا جوش تمنّا بے تاب
سامنے آئے تو جلوہ کرے مَد ہوش مجھے

کردیا حسنِ جہاں سوز کے نغموں نے ترے
ہمہ تن گوش مجھے پھر ہمہ تن جوش مجھے

مانع دستِ کرم لطف تقاضا ہے نشورؔ
ورنہ اِک قطرے میں ساقی کرے خاموش مجھے

﴿۱۲﴾

غزل مسلسل

جب سے تو سامنے اے عہد فراموش نہیں
جیسے ساون کی بہاروں کا مجھے ہوش نہیں

اب گھٹاؤں میں وہ گلبرگ بنا گوش نہیں
زُلفِ شب رنگ بلائے کمر و دوش نہیں

چشم مخمور نہیں ، سرمہ جفا کوش نہیں
ہاتھ گلرنگ نہیں، پاؤں حنا پوش نہیں

وصل کے ولولۂ شوق میں وہ جوش نہیں
ناز بے باک نہیں ، حسن قدح نوش نہیں

ناز باقی ہے مگر فتنہ گرِ ہوش نہیں
حُسن زندہ ہے مگر غارت آغوش نہیں

ایک لحظہ بھی ترا جلوہ فراموش نہیں
ایک لمحہ بھی تخیّل ترا خاموش نہیں

میں نشورؔ آج ہوں وہ شوق جو روپوش نہیں
یا کوئی چیز حجابِ نظر و گوش نہیں

﴾۱۳﴿

ہر لحظہ محبّت کا قاتل نظر آتا ہے
جینا غمِ اُلفت میں مشکل نظر آتا ہے

ہر شیوہ نزاکت کا حاصل نظر آتا ہے
ہر جلوہ پرستش کے قابل نظر آتا ہے

ظلمت کدۂ غم میں اللہ رے خیال اُن کا
دِل چاند کی دُنیا سے واصل نظر آتا ہے

ظالم ہیں نگاہیں بھی لیکن یہ ہمارا دِل
انداز محبّت کا بسمل نظر آتا ہے

اللہ رے حجاب ان کا اللہ رے شباب ان کا
دُنیا کا ہر اِک جلوہ باطل نظر آتا ہے

اے باہمہ رعنائی اے باہمہ زیبائی
تو حُسن کی دُنیا کا حاصل نظر آتا ہے

کچھ سوزِ جگر بھی ہے کچھ سازِ ترنّم بھی
شعروں میں نشورؔ اب تو شامل نظر آتا ہے

﴿۱۴﴾

حُسن کے ساتھ کچھ حجاب نہ ہو
آئنہ کیا وہ جس میں آب نہ ہو

ہے تو ممکن نگاہ سے پرہیز
ہاں مگر آپ کا شباب نہ ہو

ناز بردارِ حُسن میں ہی ہوں
اس قدر مجھ سے اجتناب نہ ہو

وہ سمجھتے نہ ہوں نگاہ مری
یا نظر کا مری جواب نہ ہو

پوچھتے کیا ہو زندگی اس کی
جس کی دُنیا میں آفتاب نہ ہو

وہ جگانے سے جاگتے بھی نہیں
اس قدر کوئی مست خواب نہ ہو

شاعری آتشِ جگر ہے نشورؔ
دیکھنا دِل کہیں کباب نہ ہو

﴿۱۵﴾

جو کیف ہے فراق میں وہ پھر کہاں وصال میں
یہ بے خودی جو ہے مجھے کسی کے ہوں خیال میں

نہ حُسن مجھ سے آشنا نہ ناز مجھ پہ ملتفت
عجیب سوز و ساز ہے نِگاہِ بے مآل میں

سخن سخن میں دلبری اَدا اَدا میں کافری
نگاہ میں عتاب میں جواب میں سوال میں

مَیں لذّتِ گناہ میں تباہ کارِ غم سہی
مجھے زمانہ چھوڑ دے مرے خراب حال میں

نہ مجھ کو غم نشورؔ کا نہ جنّتِ سرور کا
مَیں کھو چکا ہوں دِین و دِل تجلّیِ جمال میں

﴿۱۶﴾

میں دیکھتا نہیں صورت نگار خانے کی
قسم ہے تیرے تخیُّل میں ڈوب جانے کی

حجاب و ناز یہ شکلیں ہیں آزمانے کی
وہاں تو خود ہے تمنّا نقاب اُٹھانے کی

خیالِ حسن پہ ہستی ہے اِک زمانے کی
بِنا عجیب ہے اُلفت کے کارخانے کی

حدود خاک میں مَیں سر جھکا نہیں سکتا
کہ آبرو ہے جبیں تیرے آستانے کی

بنا بنا کے جو ہم کو مِٹا ہی دینا تھا
تو کیوں کسی نے یہ تکلیف کی بنانے کی

سحر کا لطف بھی جاتا ہے جلد لا ساقی
فضا تو دیکھ ستاروں کے جھلملانے کی

بنا لیا ہے فرشتوں نے آپ کے کعبہ
مگر زمیں تھی وہ میرے شراب خانے کی

زمانہ جس کو سمجھتا ہے آج شورِ نشوؔر
وہ ابتدا ہے محبّت کے اِک فسانے کی

فروغِ جام میں مطلع اس طرح ہے
مجھے کہاں ابھی فرصت نگاہ اٹھانے کی
قسم ہے حسن تخیّل میں ڈوب جانے کی
دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں شعر فروغِ جام میں شامل نہیں ہے

﴿۱۷﴾

وہ رنگ روپ وہ نقشہ وہ خال کیا کہنا
شباب عمر کا حسن و جمال کیا کہنا

کبھی عتاب کبھی انفعال کیا کہنا
حیا و ناز کی دلکش مثال کیا کہنا

وہ دونوں سمت نگاہیں جھکی جھکی رہنی
وہ جانبین سے اخفائے حال کیا کہنا

شبیہ اور پھر ان کی شبیہ جاں افزا
خیال اور پھر ان کا خیال کیا کہنا

ہمیں بھی یاد ہے آغاز اُلفت باہم
وہ شوقِ دید وہ شرمِ وصال کیا کہنا

وہ التماس نشوؔرِ خراب پے در پے
وہ لطف ساقی فرخندہ فال کیا کہنا

﴿۱۸﴾

غزل مسلسل

کبھی موصول جب مطلوب کی تحریر ہوتی ہے
قیامت کا تاثّر حشر کی تاثیر ہوتی ہے

محبّت قدر دانی شاملِ تسخیر ہوتی ہے
نگاہوں سے لگا لینا بھی کم توقیر ہوتی ہے

تمنّا در تمنّا لذّتِ تقریر ہوتی ہے
تخیّل در تخیّل حُسن کی تصویر ہوتی ہے

اشاراتِ سخن سے شوق کے احوال کھلتے ہیں
فراست آشنائے صاحب تحریر ہوتی ہے

اگر حرفِ محبّت لکھ گیا ہے لکھنے والے سے
تو قرآں چھوڑ کر اس لفظ کی تفسیر ہوتی ہے

شکایات جدائی کی تمنّا خیز شکلوں سے
غمِ خاموش کی دُنیا تکلّم گیر ہوتی ہے

کبھی نزدیکی دیدار کی پنہاں نویدوں سے
تخیّل کی شبِ تاریک پُر تنویر ہوتی ہے

اُصول دلستانی جب تغافل کوش ہوتے ہیں
بساطِ آرزو آمادۂ تسخیر ہوتی ہے

وہ جلوے جو نظر آتے ہیں خلوتگاہ رویا میں
یہ تحریرِ وفا اس خواب کی تعبیر ہوتی ہے

مگر جب ہوش آجاتا ہے بدمستِ جوانی کو
ہر اِک تحریر سے اِک شرمِ دامنگیر ہوتی ہے

نشورؔ اس باغِ ہستی میں جہاں تک میں نے دیکھا ہے
محبّت سر زمینِ حُسن کی تبخیر ہوتی ہے

﴿۱۹﴾

رَہبر جو تیری نرگسِ مے نوش ہوگئی
اصلاحِ قوم دِل سے فراموش ہوگئی

پھر زُلف زینتِ کمر و دوش ہوگئی
پھر چشم آرزو سے ہم آغوش ہوگئی

شمعِ نشاط آج سے خاموش ہوگئی
اے وہ شبیہ ناز جو روپوش ہوگئی

بیمار ہجر! شام ہوئی اور تڑپ گیا
رگ رگ کسی خیال سے پُر جوش ہوگئی

میں کیا کہوں کہ میں تو سراپائے عشق ہوں
حکمت بھی اس مقام میں خاموش ہوگئی

جلوہ حضورِ عشق کا، اللہ کی پناہ
آگے بڑھی تھی عقل کہ بے ہوش ہوگئی

دریائے غم میں ڈوب کے پیتا ہوں میں نشورؔ
فطرت مری کہاں کی بلا نوش ہوگئی

﴿۲۰﴾

ذوقِ نگاہ بازی پیہم نہ پوچھئے
نظّارۂ جمال کا عالم نہ پوچھئے

لبریز جام آپ نے دیکھا نہیں کبھی
آنکھوں کی مست خوابیِ پُرنم نہ پوچھئے

یاد آرہی ہے دیدۂ رقّت نواز کی
نرگس پہ لطف قطرۂ شبنم نہ پوچھئے

جھک جھک کے کہہ رہا ہے کسی کا سرِ نیاز
زلفوں کا پیچ اور مرا خم نہ پوچھئے

ایمائے ناز ہے کہ بہنگام گفتگو
سب پوچھئے مگر سببِ غم نہ پوچھئے

محشر میں آپ کیجئے مجرم سے باز پرُس
لیکن گناہِ اُلفت باہم نہ پوچھئے

عالم مرید آپ کا اور آپ ے مرید
تقوے میں رنگ قبلۂ عالم نہ پوچھئے

غم خانۂ خیال میں بیٹھا ہوا نشورؔ
کرتا ہے کب سے شوق کا ماتم نہ پوچھئے

﴿۲۱﴾

چتونیں وہ کہ اگر آنکھ برابر ہوجائے
اِک زمانے کا زمانہ تہِ خنجر ہوجائے

چوٹیاں ڈالے ہوئے ہند کے کافر، توبہ!
آنکھ پڑ جائے تو دِل دامنِ محشر ہوجائے

پھر کوئی سامنے بدمست کسی کے آئے
پھر ہر اِک ذرّہ کسی کا دلِ مضطر ہوجائے

پھر کوئی دیدۂ مے نوش نگاہیں ڈالے
پھر کوئی چشمِ فسوں ساز برابر ہوجائے

پھر کسی حُسن بلا نوش پہ مٹ جائے نشورؔ
پھر کسی مست جوانی کے نچھاور ہوجائے

کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات

﴿۲۲﴾

غزل مسلسل

پلا پلا کہ یہ رنگِ جہاں رہے نہ رہے
بہارِ حُسن گل و گلستاں رہے نہ رہے

یہ سرخ سرخ گلوں کا چمن ملے نہ ملے
یہ سبز سبز روش درمیاں رہے نہ رہے

یہ بھینی بھینی سی جوہی کی بو اُٹھے نہ اُٹھے
یہ نہرِ عکس بداماں رواں رہے نہ رہے

ہوائے صبح تبسّم فزا چلے نہ چلے
گلوں سے قطرۂ شبنم چکاں رہے نہ رہے

اگر یہ صبحِ گلستاں نظر فروز رہی
تو یہ تجلّیِ حُسنِ جواں رہے نہ رہے

نقابِ دُشمنِ جوشِ نظر بنے نہ بنے
نِگاہ غارتِ گلزارِ جاں رہے نہ رہے

قبا کشائیِ مستِ جمال ہو کہ نہ ہو
دراز دستیِ شوقِ نہاں رہے نہ رہے

اگر جمال بھی محوِ تجلّیات رہا
شباب حاصلِ عمرِ رواں رہے نہ رہے

اگر شباب بھی چندے رہا نظارہ پسند
تو گلفشانیِ دورِ زماں رہے نہ رہے

رہا زمانہ بھی دلکش تو کیا شمارِ حیات
نشورؔ دامنِ ہستی کشاں رہے نہ رہے

﴿۲۳﴾

چاند لطف دیتا ہے چاندنی کے ہالے میں
حُسن پھوٹ پڑتا ہے رات کے اُجالے میں

اِک نظر جہاں ڈالی کیف سے بھر آیا دل
مے فروش فطرت نے مے بھری ہے لالے میں

شور سُن کے آیا ہوں باغ میں پپیہے کا
کیا کشش ہے آفت کی پی کہاں کے نالے میں

نیم خواب آنکھوں میں کس غضب کی مستی ہے
جیسے ہلکی ہلکی سی مے بھری ہو پیالے میں

گوہرِ محبّت کو حل کیا ہوا پایا
بوتلوں کی تلچھٹ میں جام کے فضالے میں

عرش کے فرشتوں میں وہ نشورؔ کیا ہوگی
جو کشش کہ ہوتی ہے ایک حُسن والے میں

غزل مسلسل

عید کی مستیاں اِک نظر دیکھنا
حُسن والوں کی رنگیں سحر دیکھنا

رنگ نکھرا ہوا بال بھیگے ہوئے
حُسن چھایا ہوا حُسن پر دیکھنا

اپنے جلووں کے احساس میں ڈوب کر
آئنے کی طرف بے خبر دیکھنا

کوئی آئے تو اپنے میں جانا سمٹ
کوئی جائے تو مڑکر اُدھر دیکھنا

دُور ہوکر نگاہوں کی آزادیاں!
سامنے آکے نیچی نظر دیکھنا

ہے کسی کی اداؤں سے بسمل نشورؔ
عید کے دن بھی دردِ جگر دیکھنا

غزل مسلسل

اَوروں سے راہِ مصحف و زنّار پوچھئے
ہم سے سلوکِ خانہ خمّار پوچھئے

رتبہ شہیدِ عشق کا یا التہابِ شوق
جو کچھ بھی پوچھنا ہو سرِ دار پوچھئے

ہجراں نصیب حُسن کی بے تاب روح سے
رنگینیِٔ تصوّرِ گلزار پوچھئے

مجبور کرچکی ہیں مجھے بے زبانیاں
آنکھوں سے کیفِ لذّتِ دیدار پوچھئے

آوارگانِ شوق کی راہ دراز سے
ذوقِ طواف جلوہ گہ یار پوچھئے

کیا جانیں اِن رموز کو صوفی و فلسفی
رندوں سے کائنات کے اسرار پوچھئے

شاعر سہی نشورؔ مگر اس کو کیا خبر
سامع سے زخم نشترِ اشعار پوچھئے

﴿۲۶﴾

غزل مسلسل

دیا ساقی نے اوّل روز وہ پیمانہ مستی میں
کہ میں ناآشنا پی کر ہوا دیوانہ مستی میں

جو میخانے سے میں نکلا تو میرا رنگ کیا کہنا
نہیں میں دیکھتا تھا کعبہ و بت خانہ مستی میں

مری پوجا تھی کیف انگیز نظروں کی پرستاری
مرا سجدہ تھا پیش ابروئے جانانہ مستی میں

شراب آتشیں وہ ہے کہ دو اِک گھونٹ پیتے ہی
جو ساقی ہو تو آتا ہے نظر پیمانہ مستی میں

نظر آتا ہے مجھ کو بوریا بھی تختِ طاؤسی
گدا رکھتا ہے گویا سطوتِ شاہانہ مستی میں

کوئی کہتا ہے مسجد ہے کوئی کہتا ہے باہر جا
الٰہی کیا میں بھولا ہوں رہِ میخانہ مستی میں

نشہ تھا مجھ کو اور یاروں نے چاہا چھین لیں بوتل
مگر کام آ گئی کچھ ہمّتِ[1] مردانہ مستی میں

خبر کیا تھی کہ واعظ ہے یہی سمجھا کہ ساقی ہے
اُٹھا اور اُٹھ کے جا لپٹا میں بے تابانہ مستی میں

قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں جا کر
نشورؔ اس وقت ہوں کچھ ہوش سے بیگانہ مستی میں

---

[1] مجموعۂ کلام ''سوادِ منزل'' میں نشورؔ واحدی صاحب نے اسے جرأتِ رندانہ کر دیا ہے۔

﴿۲۷﴾

سبوئے چرخ ہو یا آفتاب کا ساغر
مری نظر میں ہے ہر اِک حباب کا ساغر

کسی کے سامنے لطفِ گذشتہ کا نقشہ
کسی کے ہاتھ میں عہدِ شباب کا ساغر

عجیب لطف کی شے ہے خدا نصیب کرے
خیالِ یار کی مے اور خواب کا ساغر

بجا ہے وعظ مگر توڑ کر ملے گا کیا
کسی غریب گدائے شراب کا ساغر

قریب ہو تو کسی میکدے میں پھینک آؤ
نظر بچا کے بہشتِ ثواب کا ساغر

تجلّیِ دلِ روشن نشورؔ کیا کہئے
اُٹھا کے پی گیا میں آفتاب کا ساغر

﴿۲۸﴾

کیجئے پردا مگر اتنا نہ پردا کیجئے
اِک جہانِ شوق برباد تمنّا کیجئے

پھر انھیں پُر کیف آنکھوں سے اشارا کیجئے
پھر زمانے کا زمانہ غرق صہبا کیجئے

حُسن کی مرضی پہ ایثارِ تمنّا کیجئے
لطف امروزہ فدائے عہدِ فردا کیجئے

آپ اپنی جنبشِ مژگاں سے جس کو چاہئے
راز کا پردا اُٹھا کر سر بصحرا کیجئے

آنکھ روکی ، دِل سنبھالا ، پھر بھی مجبور خیال
حُسن ! ظالم حُسن کی تصویر کو کیا کیجئے

رات سونی کیفِ مے ساقی درآغوش نشورؔ
پاسِ مستی کیجئے یا پاسِ تقویٰ کیجئے!!

﴿۲۹﴾

غزل مسلسل

اے نو بہار خم کدہ اے جانِ میکدہ
صدقے تری نگاہ کے سامانِ میکدہ

جلوہ ترا فروغِ شبستانِ میکدہ
صورت تری بہارِ گلستانِ میکدہ

اُلفت تری خلاصۂ ایمانِ میکدہ
خدمت تری شریعتِ رندانِ میکدہ

ہستی تری خزینۂ عرفانِ میکدہ
باتیں تری معانیِ قرآنِ میکدہ

سایہ ترا پناہِ فقیرانِ میکدہ
دامن ترا نجاتِ گدایانِ میکدہ

خادم ترا نشورؔ ثنا خوانِ میکدہ
تو ابتدائے میکدہ پایانِ میکدہ

بھر دے شرابِ ناب سے دامانِ میکدہ
دکھلا دے ایک جنبشِ طوفانِ میکدہ

﴿۳۰﴾

دولتِ دِل مری سرمایۂ ایماں میرا
حُسن نے لوٹ لیا ہر سروساماں میرا

دِل میں ہے نورِ تخیّل بھی ترے جلووں سے
تجھ سے روشن ہے چراغ شبِ ارماں میرا

عرضِ تفسیر ترے حسن کے آگے توبہ!
ایک جلوے میں فراموش ہے قرآں میرا

انقلاباتِ زمانہ سے یہ کہہ دے کوئی
پیکرِ شوق ہوں مِٹنا نہیں آساں میرا

آئی آواز کہ اے میرے مچلنے والے
اب تو بخشا گیا اب چھوڑ دے داماں میرا

لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا دیکھا دِل نے
میں وہ مضموں ہوں کہ عنوان ہے انساں میرا

تو مجھے ایک اشارے میں بنا دے کافر
چشمِ ساقی نہ سہی نام مسلماں میرا

سجدۂ مے تو مری اصل عبادت ہے نشورؔ
آپ سمجھیں تو سہی مذہبِ رنداں میرا

﴿۳۱﴾

غزل مسلسل

کبھی سنتے ہیں عقل و ہوش کی اور کم بھی پیتے ہیں
کبھی ساقی کی نظریں دیکھ کر پیہم بھی پیتے ہیں

خزاں کی فصل ہو روزے کے ایام مبارک ہوں
طبیعت لہر پر آئی تو بے موسم بھی پیتے ہیں

طوافِ کعبہ بے کیفیّت مے ہو نہیں سکتا
ملا لیتے ہیں تھوڑی سی اگر زمزم بھی پیتے ہیں

کہاں کی توبہ کیسا اِتّقا عہدِ جوانی میں
اگر سمجھو تو آؤ تم بھی چکھو ہم بھی پیتے ہیں

کہاں تم، دوستوں کے سامنے بھی پی نہیں سکتے
کہاں ہم، روبروئے ناصحِ برہم بھی پیتے ہیں

نشورؔ آلودۂ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے
یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

﴿۳۲﴾

غزل مسلسل

میں محوِ طوف پیہم تھا لیے پیمانہ کعبے میں
معاذ اللہ وہ میری لغزشِ مستانہ کعبے میں

جماعت کی نمازیں اور درودیوار کے بوسے
ملا رکھی ہے رسمِ مسجد و بت خانہ کعبے میں

بجائے دستِ ساقی چومتے ہیں سنگِ اسود کو
نظر آتا ہے جلوہ بے رخ جانانہ کعبے میں

قسم ہے نرگس ساقی کے مستانہ اشاروں کی
بہت یاد آئی مجھ کو گردشِ پیمانہ کعبے میں

اگر سجدہ نہ کرتا میں تو کیا کرتا کہاں جاتا
خدا بن بن کے آیا جلوۂ جانانہ کعبے میں

حدودِ شرع میں بھی دیکھنا پابندیٔ اُلفت
طوافِ شمع ہی کرتا رہا پروانہ کعبے میں

نشورؔ آخر وہاں بھی رشتۂ ساقی نہیں ٹوٹا
تجلّی بن کے آیا شاہدِ مے خانہ کعبے میں

﴿۳۳﴾

اُڑا کر لے گیا عکسِ رُخِ ساقی وہاں مجھ کو
ملا ٹوٹا ہوا آئینۂ ہستی جہاں مجھ کو

زمانہ دے رہا ہے سب نظامِ کن فکاں مجھ کو
مگر اپنی شرابِ کیف سے فرصت کہاں مجھ کو

میں کھویا جا رہا ہوں جلوۂ نورِ تخیّل میں
مٹائے جا رہی ہیں حُسن کی رنگینیاں مجھ کو

صبا کے ہر تموّج میں چمن کے ہر تبسّم میں
نظر آتی ہے فطرت گلستاں در گلستاں مجھ کو

شرابِ درد سے ذوق آشنا معلوم ہوتا ہے
نشورؔ واحدی کا کیفِ اندازِ بیاں مجھ کو

﴿۳۴﴾

ملا کے عشق مرے امتزاجِ فانی میں
لگا دی آگ حکیمِ ازل نے پانی میں

اُدھر نگاہ اِدھر آہ اُف مرے اللہ
کوئی شباب نہ ہوتا کسی جوانی میں

ترے تخیّل عہدِ شباب سے پہلے
نہ تھا چراغ مری بزمِ زندگانی میں

ہزار صبر و تحمّل کا کام دیتا ہے
کسی کا نام بلا ہائے آسمانی میں

دوام درد سہی حسرتِ مدام سہی
ہمیں بھی ڈال دے تو عشق جاودانی میں

وفورِ شوق کے عالم میں طورِ سینا پر
کسی نے دیکھ لیا ان کو لَن ترانی میں

فشار مرگ میں بھی جب کسی کی یاد آئی
نشورؔ ڈوب گیا کیفِ زندگانی میں

﴿۳۵﴾

یہاں سجدہ وہاں سجدہ معاذ اللہ دیوانہ
نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بت خانہ

تو میرا ذکر میری یاد چھوڑ اے حُسن فرزانہ
جلا دے داستاں میری بھلا دے میرا افسانہ

جفائے بے حسابانہ ادائے دلربایانہ
کوئی انداز ہو لیکن حجابانہ حجابانہ

تری آنکھیں جمال یار پر ٹھہریں تو کیا ٹھہریں
نظر اِک رشتۂ شبنم تجلّی آفتابانہ

دیارِ عشق کی دشواریاں اَلْعَظَمَۃُ لِلّٰہ
سفر پہلا مسافر بے زباں اور ملک بیگانہ

معاذ اللہ میخانے کے اورادِ سحر گاہی
اذاں میں کہہ گیا مَیں ایک دن یا پیر میخانہ

نشورؔ واحدی کی بھی غزل کیا خوب ہوتی ہے
تخیّل پاک بازانہ مگر انداز رِندانہ

﴿۳۶﴾

نگاہِ اوّلیں کا آج تک جب نام آتا ہے
وہی رعنائیاں لے کر خیالِ خام آتا ہے

میں ان جلووں میں دستِ شوق و ساغر بھول جاتا ہوں
کوئی رنگیں ادا لے کر جو رنگیں جام آتا ہے

تجھے اے حُسنِ عالم سوز آخر کب خبر ہوگی
کہ برباد تمنّا کوئی زیرِ بام آتا ہے

مسلسل شامِ غربت شامِ فرقت شامِ بیماری
مرا دل کانپ جاتا ہے جو لفظِ شام آتا ہے

محبت اور پھر ضبطِ محبت اُف معاذ اللہ
خدا کا سامنا ہے اور کسی کا نام آتا ہے

فریبِ حُسن کو بھی یاد رکھ اے تشنۂ عقبیٰ
تماشا آج کا دیکھا ہوا کل کام آتا ہے

نہ پوچھو زندگی تارِ نفس پر جینے والوں کی
کہ مرگِ ناگہاں کا ہر نفس پیغام آتا ہے

نشوؔر ان کے غرورِ حُسن کا دامن پکڑ لوں میں
مگر میری کمندِ شوق پر الزام آتا ہے

﴿۳۷﴾

اسرارِ عشق نے مرا ایماں بنا دیا
اللہ رے کفر جس نے مسلماں بنا دیا

دِل کو باضطراب نمایاں بنا دیا
یعنی کتابِ شوق کا عنواں بنا دیا

پھیلا کے ایک خرمن گل ہائے آرزو
مجھ کو اسیر تنگیٔ داماں بنا دیا

اللہ رے اِلتفات کہ اندازِ شرم نے
ہر جنبشِ نگاہ کو اَرماں بنا دیا

فکرِ معاملات نہ اندیشۂ حساب
اچھا ہوا کہ سوختہ ساماں بنا دیا

کیا بات ہے ترے لیے تکمیل آرزو
اے وہ کہ تو نے خاک سے انساں بنا دیا

تیرے تخیّلات نے محفل کو اے نشورؔ
آئینہ رکھ کے سامنے حیراں بنا دیا

﴿۳۸﴾

آیا جو حشر شورشِ امکاں لیے ہوئے
اُٹھّا میں اُن کا ہاتھ میں داماں لیے ہوئے

اس کا نیاز مند ہوں جس کی نظر نظر
ہے اِک فریبِ جنبشِ مژگاں لیے ہوئے

گزرا مرے قریب سے اِک پیکرِ شباب
نیچی نظر میں حشر کا ساماں لیے ہوئے

کس بے بسی کے ساتھ بسر کر رہا ہے عمر
انسان مشتِ خاک کا احساں لیے ہوئے

نکلا پھر آفتاب پھر آئی مری سحر
شامِ فراق شامِ غریباں لیے ہوئے

اَوراق کائنات میں اب مَیں کہاں نشورؔ
افسانہ مٹ گیا مرا عنواں لیے ہوئے

﴿۳۹﴾

وہی رفتار ہوجانا وہی گفتار ہوجانا
کمالِ عشق ہے تمثالِ حُسنِ یار ہوجانا

مرا شیوہ ہے اپنی آرزو میں دیکھ کر ان کو
ہر اِک جلوے پہ ممنونِ دلِ بیمار ہوجانا

خیال آیا کہ دل سینے کے اندر ہوگیا بسمل
یہ کس نے حسن کو سکھلا دیا تلوار ہوجانا

غرورِ حسن کے مارے ہوؤں کا شیوۂ غم ہے
''نہیں'' سن کر بھی محوِ لذّتِ انکار ہوجانا

اُڑا دے گا تمامی پردہائے راز کے ٹکڑے
غضب ہے میکشِ اسرار کا ہشیار ہوجانا

سکون آنے لگا ہے پھر مری دُنیائے مضطر میں
ذرا بیتاب کن پھر اے غمِ دیدار ہوجانا

نشورؔ واحدی کی طبعِ رنگیں اے معاذ اللہ
زمانہ چھوڑ کر آوارۂ گلزار ہوجانا

﴿۴۰﴾

رفو کا تذکرہ اے فطرتِ چالاک رہنے دے
میں اِک دیوانہ ہوں مجھ کو گریباں چاک رہنے دے

خوشی کی لذّتیں ساری مبارک تجھ کو اے ہمدم
مجھے غمگین رہنے دے مجھے غمناک رہنے دے

نہ اس کو لالہ و گل کر نہ اس کو صورتِ انساں
مری اس ایک مٹھی خاک کو بس خاک رہنے دے

نظر آتی ہیں کچھ کچھ خامیاں مشقِ تصوّر میں
ابھی کچھ دن خیالِ گیسوئے پیچاک رہنے دے

شکایتہائے رنگیں نالہائے زار سنتا جا
کسی حد تک اسیرِ زُلف کو بیباک رہنے دے

سمندِ ناز کی جولانیاں حد سے نہ بڑھ جائیں
شکارِ حُسن کو وابستۂ فتراک رہنے دے

بچھا دے جانمازِ زہد لے جاکر تہِ طوبےٰ
مرا پشمینۂ دیرینہ زیرِ تاک رہنے دے

اُٹھالے جائے سامانِ معیشت جس کا جی چاہے
مگر وہ ایک شے یعنی مے ناپاک رہنے دے

نشورؔ آخر مٹانے پر مرے کیوں ہے تو آمادہ
مرا نام و نشاں ظالم تہِ افلاک رہنے دے

۴۱

پھر نثار قدم ناز کا ساماں ہوتا
پھر کوئی ایک نظر کے لیے مہمان ہوتا

زُلف آراستہ ان کی مرا بازو ہوتی
دامن چاک مرا ان کا گریباں ہوتا

نزع کے وقت اگر وہ سر بالیں ہوتے
میں سمجھتا ہوں کہ مرنا مرا آساں ہوتا

وہ شرارہ مرے دل کا جو کسی دل میں نہ تھا
آج ہوتا تو چراغ تہِ داماں ہوتا

مژدہ خلق پہ کہتا ہے ہر اک ذرّۂ خاک
درد کی قید نہ ہوتی تو میں انساں ہوتا

اے نوا سازِ نفس اے مرے انفاس نواز
تو نہ ہوتا تو یہاں شہر خموشاں ہوتا

عمر بھر جب نہ گیا کعبہ تو کیا آخرِ عمر
زمزمی پی کے مرا کفر مسلماں ہوتا

معصیت کا نظر آتا نہ کوئی داغ نشورؔ
مے سے آلودہ اگر دامنِ ایماں ہوتا

ویران اور حسن کا منظر لیے ہوئے
اللہ رے دل تخیّل دلبر لیے ہوئے

میں لطف اُٹھا رہا ہوں دل و دلنواز کا
آئینہ آفتاب کے رُخ پر لیے ہوئے

کتنوں کو ہوش تک نہ رہا اپنے آپ کا
گزرے جو آپ زُلف مُعنبر لیے ہوئے

خود پی لیں یا پلا دیں کسی تشنہ کام کو
کیا دیکھتے ہیں ہاتھ میں ساغر لیے ہوئے

خاکِ لحد میں سوئیں گے یہ فتنہ گر تو کیا
اُٹھیں گے پھر یہ فتنۂ محشر لیے ہوئے

یہ مطربانِ بزم تو کچھ رازِ دل نشورؔ
ہیں پردۂ رباب کے اندر لیے ہوئے

جسے دُنیا میں اربابِ نظر اللہ کہتے ہیں
اسی کو اضطرابِ درد میں ہم آہ کہتے ہیں

کسی کی یاد بھی ہے اور آہِ نارسائی بھی
اُنھیں جب دیکھتے ہیں اُف مرے اللہ کہتے ہیں

مری آنکھوں سے میرے دل سے پوچھا ے پوچھنے والے
تجلّی کیا ہے اور کس کو تجلّی گاہ کہتے ہیں

عجب اُلٹا ہے آئینِ خراباتِ مغاں زاہد
کہ ہر ہستی فرامش کو یہاں آگاہ کہتے ہیں

نشورؔ واحدی یہ آپ کی آزادیاں توبہ
اسی باعث سے تو سب آپ کو گمراہ کہتے ہیں

﴿۴۴﴾

نگاہِ لطف اُٹھے یا نگاہِ ناز ہوجائے
کسی صورت سے دردِ عشق درماں ساز ہوجائے

وہ مڑکر بھی نہ دیکھیں اور شوق پائے بوسی میں
شکارِ حسن پامالِ سمندِ ناز ہوجائے

سرِ ناکام کو پھر رکھ دیا ہے آستانے پر
کہ شاید حسن کی محفل کا پا انداز ہوجائے

بھلا کیا فائدہ اس پوچھنے سے پوچھنے والے
ہمیشہ کے لیے خاموش جب آواز ہوجائے

فروغِ ہستی پیر مغاں اَلْعَظَمَۃُ لِلّٰہ
نظر اُٹھے تو سارا انکشافِ راز ہوجائے

دِل خوں گشتہ اب ضبطِ نفس سے میرے سینے میں
تڑپتا ہے کہ اشکِ دیدۂ غمّاز ہوجائے

زمانہ بھول جائے حسرتِ دل کے سوا سب کچھ
اگر دردِ محبّت کا نشورؔ آغاز ہوجائے

﴿۴۵﴾

ہوش باقی ہے ابھی آئینۂ دل ہوکر
کاش کھو جاؤں کہیں تیرے مقابل ہوکر

میں جو مد ہوش ہوا آپ نے پردا اُلٹا
آپ کو دیکھ لیا آپ سے غافل ہوکر

اِک طرف سیلِ رواں ایک طرف موجِ صبا
جل رہا ہوں میں چراغ لبِ ساحل ہوکر

مجھ کو اپنے کفِ پا سے تو لگا رہنے دے
تیری محفل میں رہوں گُل نہ سہی گِل ہوکر

کہہ رہا ہے کوئی آ جا مرے مٹنے والے
پھر مرے پردۂ انفاس سے واصل ہوکر

رِند میخوار ہو یا زاہدِ پیمانہ شکن
حسن سے دیکھ تو لے کوئی مقابل ہوکر

حیرتِ قرب حجابِ رُخِ جاناں تھی نشورؔ
قبلہ پوچھا کیے ہم کعبے میں داخل ہوکر

﴿۴۶﴾

وفا کے بعد بھی تو مائلِ جفا کیوں ہے
ترے وصال سے مشکل تری رضا کیوں ہے

وفا سکھائی ہے جب آپ نے زمانے کو
تو نام آپ کا پھر حُسنِ بے وفا کیوں ہے

سرائے عیش کی شمعیں بجھا کہیں جا کر
مرے چراغ کی دُشمن تو اے صبا کیوں ہے

زمانہ دیکھ کے بیمار ہوگیا جس کو
وہی مرے دلِ بیمار کی دوا کیوں ہے

کوئی تو راز ہے آواز میں حقیقت کا
ترانہ ہوشربا نغمہ دلربا کیوں ہے

خرامِ بادِ بہاری سے کھل گیا صحرا
چمن میں قحطِ نسیمِ بہار کا کیوں ہے

تری سبیل میں کچھ بھی نہیں تو ناجائز
مری شراب میں کچھ ہے تو ناروا کیوں ہے

فضائے روح میں رکھتے ہوئے جمالِ ابد
نشورؔ شیفتۂ حُسنِ کم بقا کیوں ہے

اس غزل کا تیسرا اور پانچواں شعر دوسرے مجموعہ کلام میں نشورؔ صاحب نے شامل نہیں کیا ہے۔

﴿۴۷﴾

بزمِ وصال میں تھا آغوشِ ناز میں تھا
اُلجھا ہوا کسی کی زُلفِ دراز میں تھا

تھی ان کی بے نیازی شکلِ نیاز مندی
افشائے راز ان کے اخفائے راز میں تھا

لطف رہِ محبت پوچھو نہ کچھ کہ ہر دم
فکرِ نشیب میں تھا خوفِ فراز میں تھا

کرتا تھا سجدہ خم کو ساغر کو میکشوں کو
مے پی کے رات ساقی کیفِ نماز میں تھا

نایابیِ طلب تھی حائل نشورؔ ورنہ
ذوقِ وصال حاصل ہر سوز و ساز میں تھا

﴿۴۸﴾

چاندنی میں ہے چاندنی آپ بھی ہیں قمر بھی ہے
آج درازِ شوق کا قصۂ مختصر بھی ہے

زُلفِ دراز پرُشکن دوش سے تا کمر بھی ہے
مستِ خرامِ ناز کا حسن شباب پر بھی ہے

شرم کی چلمنیں بھی ہیں جلوہ قریبِ در بھی ہے
پردہ بہ پردہ حسن کو آرزوئے نظر بھی ہے

چہرۂ نور بار سے گیسوئے تار تار سے
لحظہ بہ لحظہ دمبدم شام بھی ہے سحر بھی ہے

اُن کا خیال بھی نشورؔ راہ کی مشکلات بھی
فرقتِ جانگداز میں مجھ کو غمِ سفر بھی ہے

حیا کی چلمنوں میں خود نمائی بڑھتی جاتی ہے
شباب آیا ہے کافر ماجرائی بڑھتی جاتی ہے

نگاہیں ملتے ملتے دل گیا اور بے خبر پہلو
کہیں جادو سے نظروں کی صفائی بڑھتی جاتی ہے

مرے بیتاب دل سے پار ہو کر جانے کس جانب
نگاہِ شرمگینِ دلرُبائی بڑھتی جاتی ہے

اثر کے مرحلے طے کر کے نکلی ہے مرے دِل سے
اب اپنی حد سے آہِ نارسائی بڑھتی جاتی ہے

کبھی دجلہ تھا اب قلزم میں آ کر ہوگیا قلزم
ہر اِک دریا میں قطرے کی سمائی بڑھتی جاتی ہے

نشورؔ اپنی شرابِ کیف پھر مجھ کو پلا دینا
کہ عقل نکتہ داں کی پارسائی بڑھتی جاتی ہے

گوشۂ تاریک میرا رشک گلشن ہوگیا
آپ آئے تو مرا غم خانہ روشن ہوگیا

او سراپا ناز اس جانب بھی تکلیفِ خرام
اب تو میں بھی خاک ہوکر صحنِ گلشن ہوگیا

صبر کیسا اور کہاں کی داستانِ ضبطِ غم
یاد آئی اور میں بیتاب شیون ہوگیا

اِک تصوّر پر کسی کے مِٹنے والے مجھ سے پوچھ
شوق بھی محدود جلوہ بھی معیّن ہوگیا

سایۂ پیر مغاں میں آ کے ملتی تھی پناہ
مَے سکونِ زِندگی ے خانہ مسکن ہوگیا

کعبے والوں میں نظر آئی نہ جب روحِ طلب
میں بھی آخر آستاں بوس برہمن ہوگیا

پھر بہارِ تازہ آئی پھر بڑھا ذوقِ نظر
پھر نشورؔ آوارۂ اطرافِ گلشن ہوگیا

﴿۵۱﴾

دِل ربائی کی حقیقت میرے دَردِ دل میں ہے
حُسن اگر پوچھو تو میری فطرتِ کامل میں ہے

دیکھتا ہوں تجھ کو یکساں جلوہ گر دونوں جگہ
میں نہیں سمجھا کہ تو دِل میں ہے یا محفل میں ہے

جلوہ فرما فرق تجھ میں اور دِل میں کچھ نہیں
تیری منزل دِل میں ہے اور دِل تری منزل میں ہے

جس نے دیکھا ہے تجھے ہے وہ ترا محوِ خیال
تو وہ لیلیٰ ہے کہ ہے ایک اور سو محمل میں ہے

اللہ اللہ کارسازی عشقِ عالم سوز کی
کس قدر خاموش میری ہستیِ غافل میں ہے

خاص اندازوں سے ہر عاشق نہیں واقف نشورؔ
اِک زمانہ محو اس کے عشوۂ باطل میں ہے

تخاطب آتشیں ہوکر تکلّم خشمگیں ہوکر
محبّت بھولے جاتے ہیں محبّت آفریں ہوکر

کسی کا پردہ رکھتا ہوں میں پیوندِ زمیں ہوکر
بلا میں پھنس گیا رازِ محبّت کا امیں ہوکر

جوانی کی ادائے احتجابانہ معاذ اللہ
سمائے جارہے ہیں میرے دِل میں شرمگیں ہوکر

میں عالم اور عالم کے تماشے بھول بیٹھا ہوں
تمھیں تم رہ گئے ہو میرے دل میں دِلنشیں ہوکر

نظر اے رحمتِ ساقی مدد اے گردشِ ساغر
پھنکا جاتا ہوں میں ذوقِ شراب آتشیں ہوکر

بہار آئی کبھی یا ہوگیا برپا کبھی محشر
نشورؔ آخر کوئی کیونکر رہے جزو زمیں ہوکر

ملامت گر ہماری زندگی کے ساتھ رونا ہے
نفس کا تار جب تک ہے ہمیں موتی پرونا ہے

سرورِ بے خودی میں عمر اچھی کٹتی جاتی ہے
غمِ دُنیا کہاں تک کھایئے ہوگا جو ہونا ہے

مری خوشیاں اگر سمجھو تو اِک صورت سے ماتم ہیں
میں شمعِ بزمِ عبرت ہوں مرا ہنسنا ہی رونا ہے

ہمیں اے خوابِ خوش بے خوابیِ ہجراں غنیمت ہے
لحد تک جاگ کر پھر حشر تک سونا ہی سونا ہے

نہ بڑھ اے کاروانِ شوقِ اُلفت کے منازل سے
کہ آگے اور جا کر مُفت جان و دل کا کھونا ہے

نشورؔ اُٹھو کہ سامانِ صبوحی کے لیے تم کو
نمازِ صبح سے پہلے صراحی جام دُھونا ہے

﴿۵۴﴾

ہوش و ہواس بادہ و پیمانہ لے گیا
صبر و قرار جلوۂ جانانہ لے گیا

رِندوں کے میکدوں میں حسینوں کی بزم میں
ہم کو کہاں کہاں دِل دیوانہ لے گیا

مرغِ سحر بھی واقفِ اسرار تھا مگر
بازی قمارِ عشق میں پروانہ لے گیا

خود مستیِ نگاہ سے لبریز ہوگیا
ساقی کے آگے جب کوئی پیمانہ لے گیا

کس حُسن دیدہ سوز کا جلوہ تھا جو نشورؔ
سب امتیازِ کعبہ و بت خانہ لے گیا

﴿۵۵﴾

ضبطِ غم اِک داستاں ہی اَور ہے
بے زبانی اِک زباں ہی اَور ہے

جس کا دُنیائے محبّت نام ہے
وہ زمیں وہ آسماں ہی اَور ہے

قالبِ خاکی میں ہے بے چین سی
میں جو رکھتا ہوں وہ جاں ہی اَور ہے

جنبشِ اَبرو نگاہِ دِل نواز!
یہ کوئی تیر و کماں ہی اور ہے

اشک بھر آتے ہیں آنکھوں میں نشورؔ
آپ کا طرزِ بیاں ہی اور ہے

﴿۵۶﴾

گزرے ترے خیال میں راہِ یقیں سے ہم
ٹکرا گئے تجلّیِ عرشِ بریں سے ہم

پردے اُٹھا دیئے ہیں کہ شکلِ خیال ہے
پھر دیکھنے لگے تری منزل یہیں سے ہم

ہم کو وہی تصوّرِ جاناں بتایئے
مجبور ہیں تخیّلِ دُنیا و دِیں سے ہم

دامن ترا نہ حشر میں بھی ہم پکڑ سکے
آگے نہ بڑھ سکے تری چینِ جبیں سے ہم

دُنیائے آب و خاک سے تا جلوہ گاہ غیب
سب دیکھتے ہیں حسن کے نورِ یقیں سے ہم

پھر حضرت نشورؔ کو ہم بھول جائیں گے
پھر کام لیں گے جامِ مے آتشیں سے ہم

﴿۵۷﴾

مجھ کو یہ انجام کیا معلوم تھا آغاز میں
وہ نہ ہوں گے میری مرگِ تفرقہ پرداز میں

نیچی نظروں نے اَدب سکھلا دیا گستاخ کو
تازیانہ مار کر اِک شرم کے انداز میں

اشکِ خوں کہتا ہے دِل میں خشک ہوجانا قبول
کون رُسوا ہونے جائے دِیدۂ غمّاز میں

مطربِ فرزانہ اب لے اپنے پردوں کی خبر
نغمہ دیوانہ ہوا آ کر مقامِ راز میں

عشق پرُ نیرنگ تیری بے مثالی ہے عجیب
عجز کا پہلو بھی داخل ہے ترے اعجاز میں

نغمہ آہِ آتشیں ہوکر نکلتا ہے نشورؔ
کچھ مرا سوزِ جگر ہے پردہ ہائے ساز میں

۵۸

خوب ہے ساقی جو تیری نرگسی چتون میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو مینائے رگِ گردن میں ہے

اللہ اللہ حسن روز افزوں کی باطن تابیاں
چاند کی دُنیا مری تخئیل کے دامن میں ہے

چشمِ بینا ڈھونڈنے والے کہاں تک جستجو
پردہ اُٹھے روشنی ہر دیدۂ سوزن میں ہے

دِل کے ٹکڑے اُڑ گئے ہوں یا جگر کی دھجّیاں
کچھ نہیں سنتا جو اپنی لذّتِ شیون میں ہے

آہ بیمارِ محبت اُف اسیرِ آرزو
کھچ رہی ہے روح لیکن ہاتھ ابھی گردن میں ہے

یہ بہاریں یہ پھواریں اور یہ مینڈھی نشورؔ
ہائے وہ کافر جوانی جو کسی ساون میں ہے

۵۹

یادِ گل بھی بھلا نہیں سکتا
گلستاں میں بھی جا نہیں سکتا

خوگرِ جورِ یار ہوں لیکن
ناز دُشمن اُٹھا نہیں سکتا

المدد اے صبا کہ کانٹوں سے
پھول دامن چھڑا نہیں سکتا

اللہ اللہ رے شاہدِ مقصود
دیکھ سکتا ہوں پا نہیں سکتا

دِل میں ہے میرے ایک دَردنشورؔ
جس کو اب میں چھپا نہیں سکتا

﴿۶۰﴾

کشاکش میں نہیں عکس زمین و آسماں لے کر
مرا آئینہ گم ہے پرتوِ پیرِ مغاں لے کر

قیامت گاہِ غم میں جمع ہونے دیجئے سب کو
ابھی کیا کیجئے گا مُشتِ گِل کا امتحاں لے کر

خرابِ میکدہ ہر دم نئی دُنیا میں ہے زاہد
مگر تو ہے کہ بیٹھا ہے وہی دونوں جہاں لے کر

جہاں پہلے سفر میں کی تھی میں نے منزل اوّل
زمانہ اب وہاں پہنچا ہے گردِ کارواں لے کر

ارے توبہ قیامت کیا مرے دِل سے کوئی پوچھے
قریبِ پردہ آجانا کسی کا بجلیاں لے کر

نشورؔ آخر مجھے اُمید ہے حلِّ تمنّا کی
اُسے کہئے جو بیٹھا ہو فراقِ جاوداں لے کر

﴿۶۱﴾

آج ساقی نے یہاں ختم تقاضا کردیا
مڑ کے دیکھا اور پیمانوں کو صہبا کردیا

ذرّے ذرّے کو بنایا اِک بیابانِ تپش
قطرے قطرے کو کشش کا ایک دریا کردیا

حسن سے آباد ختمِ آفرینش تک رہے
وہ کہ جس نے مجھ کو بربادِ تمنّا کردیا

اے طبیبِ روح اے سرمایۂ رُوح القُدس
تو نے جس بیمار کو دیکھا مسیحا کردیا

جلوہ تیرا اور نظّارہ پسندوں کا ہجوم
اے تماشاگر تجھے کس نے تماشا کردیا

میں سمجھتا ہوں وہی سوزِ محبّت ہے نشورؔ
جس نے دل میں شعلۂ احساس پیدا کردیا

﴿۶۲﴾

اتنا کوئی سمجھ لے اپنا وجود کیا ہے
پھر سجدہ کر کے دیکھے لطفِ سجود کیا ہے

مردانگی میں مجنوں حاتم سے بڑھ گیا ہے
موجِ وفا کے آگے دریائے جود کیا ہے

کردار پہلے پیدا پھر پوچھ مجھ سے ہمدم
نغموں میں کیوں کشش ہے جانِ سرود کیا ہے

اِک جام بےخودی کا دینا کہ میں بھی دیکھوں
دینِ مجوس کیا ہے کیشِ یہود کیا ہے

جل اے چراغِ تربت کیا پوچھتا ہے میری
میں خاک ہو چکا ہوں یہ داغ و دُود کیا ہے

گم ہے نشورؔ بھی اور عالم کی وسعتیں بھی
دِل کیا ہے اور دِل کی حدِّ نمود کیا ہے

﴿۶۳﴾

حیراں ملائکہ مرے نورِ وجود پر
نازاں اُلوہیت مرے داغِ سجود پر

بجلی سی گر گئی مری جانِ نمود پر
میں تو تڑپ گیا ترے رنگِ شہود پر

جو چاہئے حدود محبت میں کیجئے
پردا مرا ہے آپ کی شرمِ وجود پر

آئینہ جمال ہوں میں ہی حضور کا
پرتو تو ڈالیے مری شکلِ نمود پر

میں اپنی آرزو کا بھی مالک نہیں نشورؔ
قبضہ اُنھیں کا ہے ابھی میرے حدود پر

﴿۶۴﴾

یہ خود نُمائیاں تری ہیں جانِ بے خودی
اللہ رے وہ خودی کہ ہے سامانِ بے خودی

کہنا پڑا غرور کو عرضِ نیاز پر
میں خود پرست حسن ہوں تو شانِ بے خودی

دیوانہ ہوں مگر تجھے پہنچانتا ہوں مَیں
مضمون ہوش ہے مرا عنوانِ بے خودی

ٹوٹے نظام، محفلِ ہستی بدل گئی
بدلا نہیں مگر مرا ایمانِ بے خودی

ہستی تمام لذّت بدمستیِ نگاہ
عالم تمام جلوۂ جانانِ بے خودی

دھو دے مرے ضمیر سے اسرارِ فلسفہ
اے وہ کہ تو ہے ساقیِ طوفانِ بے خودی

شعرِ غزل کہ نذر بہ چشتیؔ[۱] ہمی کنُم
یادے بود زلمحۂ رقصانِ بے خودی

---

۱ ایم چشتی بیگم (شریکِ حیات)
دوسرے شعری مجموعے میں یہ مصرع یوں ہے، ''شعر غزل کہ نذر بہ چشتی کند نشورؔ''

آتش و نم

۱۹۴۱

سے

۱۹۴۶

تک

(۶۵)

آنسو

جب سے کہ محبت ہوئی پیارے ہیں یہ آنسو
جیسے کہ مری آنکھ کے تارے ہیں یہ آنسو

کہتے ہو کہ للہ اب آنسو نہ گراؤ
ایسے میں کہ جینے کے سہارے ہیں یہ آنسو

ہاں ہاں انھیں دامانِ محبت میں جگہ دو
آنکھیں ہیں مری اور تمھارے ہیں یہ آنسو

ہر خونِ جگر کے لیے تیار ہوں اب بھی
ہارا ہوں نہ میں اور نہ ہارے ہیں یہ آنسو

سیماب ہیں جب تک کہ ہیں یہ قلب و جگر میں
آنکھوں میں جب آئے تو ستارے ہیں یہ آنسو

بے چین اُمنگوں نے نہ سمجھا ہی نہ دیکھا
بے تاب جوانی کے نظارے ہیں یہ آنسو

غم وہ ہے جو ہر چیز کو پگھلا کے بہا دے
پانی نہیں سیال شرارے ہیں یہ آنسو

معصوم نگاہوں کو بھگوتے ہیں یہ اکثر
پوشیدہ محبت کے اشارے ہیں یہ آنسو

غم خوار ہیں میرے لیے شبہائے الم میں
آخر تو غمِ دوست کے مارے ہیں یہ آنسو

غم وہ ہے جو دو اَرمانوں کی تسکین میں حائل ہو جائے
یعنی کہ ہوں خشک لبِ ساحل اور بیچ میں دریا لہرائے

اس بزمِ محبت میں آ کر بیٹھے تھے کہ محفل ختم ہوئی
دِل کے نہ فسانے سن پائے غم کی نہ کہانی کہہ پائے

خورشیدِ قیامت کے آگے کرنوں کا مقابل کیا ہوگا
جو ملک بسے شب خانوں میں جو قوم چلے سائے سائے

یوں عہدِ جوانی بیت گیا اور یادِ جوانی دِل میں رہی
جیسے کوئی جائے چھوڑ کے گھر اور دیپک جلتا رہ جائے

آغوشِ مسرّت میں جینا مشروط ہے غم میں مرنے پر
جو سو نہ سکے وہ کیا جاگے جو کھو نہ سکے وہ کیا پائے

تخئیل کی فرضی دُنیا میں کیا مشقِ سخن کی پروازیں
شاعر تو وہی شاعر ہے نشورؔ اِک شعر کہے اور تھرّائے

پروردۂ دردِ حرماں ہوں مَیں لذّتِ درماں کیا جانوں
میں چاکِ گریباں ہوں اپنا مَیں حسن کا داماں کیا جانوں

دیکھا ہے انھیں دیکھا ہے مگر حائل تھے حجابِ حسن ونظر
میں حالِ پریشاں کہہ نہ سکا وہ زُلفِ پریشاں کیا جانوں

میں کارِ زمیں بھی کر نہ سکا پروازِ فلک کے کیا معنے
کافر بھی مکمّل ہو نہ سکا اسرارِ مسلماں کیا جانوں

اس حسن کے سنگِ دولت پر سجدوں کا مرے انجام نہ پوچھ
میں گوشۂ خاطر پا نہ سکا وہ گوشۂ داماں کیا جانوں

تعلیم دُرخشاں کے جلوے تہذیبِ زرافشاں کے دھوکے
میں گردشِ انساں کا مارا یہ گردشِ دوراں کیا جانوں

میں خون کے قطروں کو ہمدم گنتا نہیں غداروں کی طرح
میں تشنۂ آبِ خنجر ہوں میں پاسِ رگِ جاں کیا جانوں

ہر گام پہ جلوے حُسن کے تھے لیکن نہ ہر اِک پر لوٹ ہوا
میں عظمتِ دِل کا رکھوالا بازیچۂ ارماں کیا جانوں

گلزار میں جس دم میں پہنچا سوکھے ہوئے غنچے بھی نہ ملے
دامانِ خزاں بھی چھو نہ سکا اندازِ بہاراں کیا جانوں

اغیار کے آگے جھکتے ہیں کس طرح مجھے معلوم نہیں
میں شاعرِ طبعِ آزادی آدابِ غلاماں کیا جانوں

وہ رات تھی میری رات بھی جو آغوش میں بھی کاٹے نہ کٹی
میں صبحِ غریباں کر نہ سکا یہ شامِ غریباں کیا جانوں

ہستی نے نشورؔ آتش ہوکر کاشانۂ اُلفت پھونک دیا
میں خاکِ گریباں کا مالک یہ چاکِ گریباں کیا جانوں

﴿۶۸﴾

اُس دِل کی مصیبت کون سنے جو غم کے مقابل آ جائے
کس نے یہ کہا تھا تنکے سے وہ بجلی سے ٹکرا جائے

دُنیا کی بہاروں سے آنکھیں یوں پھیر لیں جانے والوں نے
جیسے کوئی لمبے قصّے کو پڑھتے پڑھتے اُکتا جائے

آغازِ محبت ہے اور دِل یوں ہاتھ سے نکلا جاتا ہے
جیسے کسی اَلّھڑ کا آنچل سرکا جائے ڈھلکا جائے

گزرے ہوئے دلکش لمحوں کی بھولی ہوئی یاد ایسی آئی
جیسے کوئی پیتم پردیسی سوتے میں اچانک آ جائے

جب پہلے پہل محسوس ہوا ہے حسن تو دل ایسا کانپا
جیسے کہ دلہن پہلی شب کی آہٹ جو ملے تھرّا جائے

کنگھے سے گھنیری زُلفوں میں یوں لہریں اُٹھتی جاتی ہیں
جیسے کہ دُھندلکا ساون کا بڑھتا جائے بڑھتا جائے

ہستی کا نظارہ کیا کہیے مرتا ہے کوئی جیتا ہے کوئی
جیسے کہ دِوالی ہو کہ دِیا جلتا جائے بُجھتا جائے

اِک آس جو دِل کی ٹوٹ گئی پھر دل کی خوشی باقی نہ رہی
جیسے کہ اندھیرے گھر کا دِیا گُل ہو تو اندھیرا چھا جائے

دِل ہے کہ نشورؔ اِک باجا ہے سینے کے اندر تاروں کا
جب چوٹ پڑے جھنکار اُٹھے جب ٹھیس لگے تھرّا جائے

﴿۶۹﴾

اِدھر اُدھر سے حسن کو سمیٹتا چلا گیا
نئ نئ جوانیوں کو دیکھتا چلا گیا

جو منزلِ شباب کی طرف بڑھا تو کیا کہوں
قدم قدم پہ خاکِ دل بکھیرتا چلا گیا

نہ رنج و غم میں مَیں مِٹا نہ رنگ و بو میں مَیں پھنسا
تمام داغ و دردِ دل سے کھیلتا چلا گیا

تعلّقاتِ ظاہری کو جا بجا سے توڑ کر
یہ ڈور آب وخاک کی لپیٹتا چلا گیا

بڑھا جو دستِ آرزو تو دامنِ نگاہ میں
تمام کائنات کو سمیٹتا چلا گیا

خیالِ مرگ و زیست کو نشورؔ چھوڑتے ہوئے
تَمام سرنوشتِ غم کو میٹتا چلا گیا

﴿۷۰﴾

سرشار جوانی کا عالم شانوں پہ لٹیں حلقوں والی
جیسے کہ چڑھے ساون میں اُٹھے بھادوں کی گھٹا کالی کالی

یہ عمر بھی ظالم کیا کہنا، صہبا میں ملے جیسے پارا
ویسے ہی محبت بھی چنچل جیسی کہ جوانی متوالی

مایوس فضاؤں میں دل کو اِک آس نے ایسا تڑپایا
جیسے کہ گھٹاؤں کی رُت میں چٹکی لے جگر میں ہریالی

بے یاد جمالِ یار ہے یوں دِل کی بستی سونی سونی
جیسے کہ ہو تنہا راتوں میں آغوشِ طلب خالی خالی

یوں نذرِ محبت ہوتا ہے رنگین آغاز جوانی کا
جیسے کوئی کمسن پوجا کو پھولوں کی چلے لے کر تھالی

کھوئی سی تمنّا اُلفت کی یوں پہلے پہل دل میں آئی
جیسے کسی شادی کے گھر میں دولھن اُترے بھولی بھالی

احساسِ محبت میں کھو کر یوں دِل کو ملامت کرتا ہے
جیسے کہ نشے کے عالم میں دیتا ہو کوئی بہکی گالی

یوں دِل کو محبت میں رکھ کر ہوتا ہے سرورِ غم حاصل
جیسے کہ نہا کر اُٹھنے پر آنکھوں میں پھرے ہلکی لالی

قدرت بھی نکمّی قوموں کو دُنیا سے فَنا کر دیتی ہے
جیسے کسی سوکھے پودے کو چلنے میں کچل ڈالے مالی

پھیکا ہے جوانی کا عالم جب دِل کی رَگوں میں خون نہ ہو
جیسے کہ سحر ہو ہولی کی اور رنگ سے ہو بوتل خالی

یوں وصل کے رنگیں لمحوں کو گھیرے ہوئے ہے تاریکیٔ غم
جیسے کہ حنائی ہاتھوں میں چوڑی ہو پڑی کالی کالی

یوں جانِ تمنّا سے مِل کر آتے ہیں نشورؔ اُمڈے آنسو
جیسے کہ عدالت کے آگے بے باک ہو مجرم اقبالی

۱۷۱

حقیقت جس جگہ ہوتی ہے تابانی بتاتی ہے
کوئی پردے میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے

وہ آئے بھی نہیں اور زندگی کی رات جاتی ہے
سحر ہوتی ہے اور شمعِ تمنّا جھلملاتی ہے

ستاروں کا سہارا لے کے دھرتی بیٹھ جاتی ہے
فلک کو دیکھ کر جس دم غریبی مسکراتی ہے

میں دامن تھامتا ہوں اور ادا دامن چھڑاتی ہے
محبت ہے تو کچھ بیگانگی بھی پائی جاتی ہے

مری ناکامیِ غم ذوقِ حیرانی بناتی ہے
یہ دُنیا دُور سے میری نظر میں جگمگاتی ہے

سکوتِ وصل کا لمحہ بھی کیا بیدار خوابی ہے
محبت جاگتی ہے اور جوانی سوئی جاتی ہے

وہ جب سنجیدہ ہوتے ہیں ادا انگڑائی لیتی ہے
وہ جب خاموش ہوتے ہیں جوانی گنگناتی ہے

زمانہ ہے کہ دلگیری میں افسردہ سا رہتا ہے
طبیعت ہے کہ غمگینی میں جولانی پہ آتی ہے

ہوائے دامنِ نکہت فزا کا واسطہ تم کو
ذرا ٹھیر چراغِ زیست کی لو تھرتھراتی ہے

مسلسل گلشنِ ہستی میں کانٹے اس نے بوئے ہیں
یہ دُنیا پھر انھیں کانٹوں سے کیوں دامن بچاتی ہے

نہ غم فرصت ہی دیتا ہے نہ آنسو بند ہوتے ہیں
برستا جارہا ہے مینھ بدلی بنتی جاتی ہے

یہی ہستی نشورؔ اِک روز ہے انجامِ ہستی بھی
یہی دُنیا کسی منزل پہ عقبیٰ ہو کے آتی ہے

﴿۷۲﴾

چلمن سے جو دامن کے کنارے نکل آئے
وارفتہ نگاہی کے سہارے نکل آئے

پیمانہ بکف ساتھ تمھارے نکل آئے
ہنگامۂ ہستی سے کنارے نکل آئے

اِک سادگی حسن کی معصوم ادائیں
رنگین مضامیں کے اشارے نکل آئے

دولت کا فلک توڑ کے عالم کی جبیں پر
مزدور کی قسمت کے ستارے نکل آئے

سب بھول گئے پیچ و خمِ ہوش میں رستہ
اس راہ پہ کچھ عشق کے مارے نکل آئے

سب ڈوب گئے تلخیِ ناکامیِ غم میں
کچھ آپ کے دامن کے سہارے نکل آئے

گستاخیِ باراں سے وہ پیراہن پُر نَم
بھیگے ہوئے جلوؤں سے شرارے نکل آئے

رخصت کے وہ آنسو وہ نگاہوں کی اُداسی
تھی شام مگر صبح کے تارے نکل آئے

آنکھوں میں نظر آنے لگے خون کے آنسو
اُٹھو کہ بس اب سرخ ستارے نکل آئے

رضواں سے بغاوت ہے نشورؔ اور مئے کوثر
عقبیٰ میں بھی کچھ کام ہمارے نکل آئے

۷۳

فضا پروردۂ عطرِ جوانی ہوتی جاتی ہے
جہاں وہ ہیں وہاں ہر شے سہانی ہوتی جاتی ہے

حیاتِ غم مری دلکش کہانی ہوتی جاتی ہے
محبت انقلابِ زندگانی ہوتی جاتی ہے

سحر اور شام یوں ہی زندگانی ہوتی جاتی ہے
زمانہ بیتا جاتا ہے کہانی ہوتی جاتی ہے

اُدھر وہ کھوئے کھوئے سے اِدھر میں بہکا بہکا سا
محبت بھی شرابِ ارغوانی ہوتی جاتی ہے

وہی ہے ضبطِ غم لیکن اب آنسو آئے جاتے ہیں
وہی ہے دل مگر اب آگ پانی ہوتی جاتی ہے

ہزاروں عالمِ رنگیں کے بعد اِک ساعت غمگیں
جو باقی ہے وہ میری عمرِ فانی ہوتی جاتی ہے

نہیں معلوم دِل کھو کر پھر اپنا حشر کیا ہوگا
جہاں تک دل ہے اُن کی مہربانی ہوتی جاتی ہے

گزشتہ اُلفتوں کا نقش گہرا ہوتا جاتا ہے
جو دُنیا مٹ گئی ہے غیر فانی ہوتی جاتی ہے

اُمنگیں ہیں کہ اب تک ابتدائے آرزو میں ہیں
جوانی ہے کہ یاں ہر لحظہ فانی ہوتی جاتی ہے

نشورؔ اب اور ہی صورت ہو جینے کی تو بہتر ہے
نئی دُنیا بھی نظروں میں پرانی ہوتی جاتی ہے

﴿۷۴﴾

حسرتِ فیصلۂ دردِ جگر باقی ہے
اور ابھی سلسلۂ شام و سحر باقی ہے

آیئے اور نظر سے بھی زمانہ دیکھیں
زندگی ہے تو محبت کی نظر باقی ہے

یا مری صبح میں رونق نہیں ہنگاموں کی
یا مری شام بعنوانِ سحر باقی ہے

نوجوانی گئی انفاس کی خوشبو نہ گئی
پھول مرجھا ئے مگر بادِ سحر باقی ہے

کوچ ہی کوچ ہے ہر رنگ میں دُنیا کی حیات
اِک سفر ختم ہوا ایک سفر باقی ہے

یادگارِ حرم و دیر ہے ٹوٹا ہوا دل
شہر ویران ہوا ایک یہ گھر باقی ہے

حُسن دلکش ہے جہاں تک ہے تبسّم کا ثبات
عشق زندہ ہے اگر دیدۂ تر باقی ہے

بے مے و رنگ ہے کاشانۂ تہذیب جدید
کچھ پسِ پردہ نہیں پردۂ در باقی ہے

زندگی کیا ہے ابھی تجربہ کرنا ہے نشورؔ
شاعری کیا ہے ابھی نقد ونظر باقی ہے

﴿۷۵﴾

سحر اور شام سے کچھ یوں گزرتا جا رہا ہوں میں
کہ جیتا جا رہا ہوں اور مرتا جا رہا ہوں میں

تمنّائے محالِ دل کو جزوِ زندگی کر کے
فسانہ زیست کا پیچیدہ کرتا جا رہا ہوں میں

گلِ رنگیں یہ کہتا ہے کہ کھلنا حسن کھونا ہے
مگر غنچہ سمجھتا ہے نکھرتا جا رہا ہوں میں

مرا دِل بھی عجب اِک ساغرِ ذوقِ تمنّا ہے
کہ ہے خالی کا خالی اور بھرتا جا رہا ہوں میں

کہاں تک ارتباطِ جان و جاناں کا تعلّق ہے
سنورتے جا رہے ہیں وہ سنورتا جا رہا ہوں میں

جوانی جا رہی ہے اور میں محوِ تماشا ہوں
اُڑی جاتی ہے منزل اور ٹھہرتا جا رہا ہوں میں

بہت اُونچا اُڑا لیکن اب اس اوجِ تخیّل سے
کسی دُنیائے رنگیں میں اُترتا جا رہا ہوں میں

نشورؔ آخر کہاں تک فکرِ دُنیا دل دکھائے گی
غمِ ہستی کو ذوقِ شعر کرتا جا رہا ہوں میں

﴿٧٦﴾

اپنی دُنیا خود بہ فیضِ غم بنا سکتا ہوں میں
اک جہانِ شوق نامحکم بنا سکتا ہوں میں

میری آنکھوں میں ہیں آنسو تیرے دامن میں بہار
گل بنا سکتا ہے تو شبنم بنا سکتا ہوں میں

دل کے باجے میں نہیں معلوم کتنے تار ہیں
حسن کو اِک تار کا محرم بنا سکتا ہوں میں

پھر حقیقت کی اسی جنّت کی جانب لوٹ کر
بندگی کو لغزشِ آدم بنا سکتا ہوں میں

زندگی کو میں نے بخشی ہے متاعِ صد فریب
راستہ سیدھا ہے پیچ وخم بنا سکتا ہوں میں

حاصل اشکِ ندامت کچھ نہیں اس کے سوا
ہے جو دامنِ تر اسی کو نَم بنا سکتا ہوں میں

عشق ہوں میرے لیے پاسِ حدودِ ہوش کیا
ہو کے دیوانہ بھی اِک عالم بنا سکتا ہوں میں

جس قدر آنسو گرے اتنا ہی انساں ہو سکا
زندگی شاید بقدرِ غم بنا سکتا ہوں میں

خود شناسی کی شرابِ آتشیں بھر کر نشورؔ
کاسۂ مفلس کو جامِ جم بنا سکتا ہوں میں

۷۷

بُھلاتا ہوں مگر غم کی درخشانی نہیں جاتی
وہ آئینہ مقابل ہے کہ حیرانی نہیں جاتی

نگاہِ شوق سے تا دیر حیرانی نہیں جاتی
شباب آیا تو ظالم شکل پہچانی نہیں جاتی

تجھے دیکھوں کہ تیرے اِلتفاتِ نرم کو سمجھوں
محبت بھی ترے جلوؤں میں پہچانی نہیں جاتی

سحاب و سیل دُھو سکتے نہیں گردِ فلاکت کو
بہار آئی مگر دُنیا کی وِیرانی نہیں جاتی

کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں سوزشِ دل کا
بہت رویا مگر غم کی گراں جانی نہیں جاتی

کلیاتِ نشورؔ واحدی حصہ غزلیات

جوانی کو گناہوں سے الگ کرنا نہیں ممکن
یہ وہ مے ہے جو فرطِ کیف سے چھانی نہیں جاتی

محبت تار تار پیرہن کر اپنے کانٹوں سے
کہ ان پھولوں سے میری تنگ دامانی نہیں جاتی

نشورؔ اس وقت بھی دُنیا اَسیرِ مُلک و دولت ہے
ابھی فکر و نظر تا حدِّ انسانی نہیں جاتی

کتنا عجیب تر ہے یہ ربطِ زندگانی
ہستی تمام شُعلہ عالم تمام پانی

جلوے یہی رہیں گے نظریں یہی رہیں گی
باقی ہے اور رہے گا یہ ارتباطِ فانی

ہے اِک زبانِ اُلفت ہر پیکرِ محبت
آنسو بھی ترجمانی گیسو بھی ترجمانی

اِک لمحۂ تبسّم وہ لمحۂ نظر ہے
جس پر کوئی لٹا دے اِک عمرِ جاودانی

پھولوں کو تولنا ہے کانٹوں سے کھیلنا ہے
دل کی نزاکتوں میں ان کی مزاج دانی

غم زندگی ہے لیکن شاعر نشورؔ تیرا
نغموں سے کھیلتا ہے جب تک ہے زندگانی

کوئی طوفان ہو محوِ دوست ہے بزمِ محبت بھی
میں بیٹھا ہوں یہیں کہہ دو گزر جائے قیامت بھی

مزاجِ حسن کچھ برہم ہے دُزدیدہ نگاہوں سے
نظر نے چھولیا ہے جیسے دامانِ نزاکت بھی

یہ ذوقِ شعلہ کے مارے ہوئے آخر کہاں جائیں
جسے کہتے ہیں دوزخ ہے وہ اِک پہلوئے جنت بھی

گلستاں کی بہاروں میں زہے تشریف ارزانی
وہ یوں آئے کہ شرما سی گئی پھولوں کی نکہت بھی

شراب عیش کے مِینا کشو یہ سوچ کر پینا
پسینہ ہے کسی کی موت کا صہبائے عشرت بھی

جوانی حشر ہے جب حسن کا احساس ہوجائے
کہ قامت بھی ہے یہ تخلیق رنگیں اور قیامت بھی

عتابِ حسن دلکش تر سہی لیکن ملال ان کا
وہ منظر ہے جہاں تھرّا گئی دل کی حقیقت بھی

جوانی گلشن عالم کا جزوِ غیر فانی ہے
یہ وہ گل ہے کہ ہے جس میں مرا رنگِ طبیعت بھی

اُدھر جھکتی ہے جس جانب سے بوئے دوست آتی ہے
ترازو ہے شکستِ رنگ کی شاعر کی فطرت بھی

﴿۸۰﴾

حسن جو چودھویں برس آ کے شباب سے ملا
جیسے کہ نغمۂ لطیف کیفِ شراب سے ملا

خوش وہ نہیں خفا سہی ''ہاں'' وہ نہیں ''نہیں'' سہی
کانوں کو ایک ذوق تو ان کے جواب سے ملا

پردۂ دِل کے اُس طرف جلوہ بے پناہ ہے
جیسے کہ ہو کھڑا کوئی دل کے حجاب سے ملا

مدرسۂ تصوّرات غرقِ شرابِ شوق کر
مجھ کو کہ میں ہوں مردِ علم کچھ نہ کتاب سے ملا

آئیں جوانیاں تو بس شورِ گناہ الاماں
جیسے کہ دردِ دل کہیں آتش و آب سے ملا

راز ہے کچھ گریز میں بات ہے کچھ بچاؤ میں
ان کے شباب کا پتہ ان کے حجاب سے ملا

حُسن و نظر میں کھو گیا عشق تو فیصلہ ہوا
نشّہ شراب میں کھنچا نغمہ رباب سے ملا

فطرتِ غم کی بندشیں روک سکیں نہ عشق کو
حسن و جمال پھوٹ کر شوق و شباب سے ملا

دِل جو ٹھہر گیا نشورؔ درد بھی مٹ گیا وہیں
ہائے کہ نقشِ آرزو نقشِ برآب سے ملا

۸۱

وہ آئے اس طرف اور یوں بہ طرزِ خوشگوار آئے
اچانک جیسے محفل میں کہیں پھولوں کا ہار آئے

غمِ یار و غمِ ہجر و غمِ آشفتہ سامانی
بہت غم کھا چکے اب کیا غمِ دُنیا سے عار آئے

فلک نے چھین لیں رنگینیاں اور لوٹ لی نکہت
مرے اُجڑے ہوئے گلشن میں کیا لے کر بہار آئے

لڑکپن کی ادائیں شرمگیں یوں ہوتی جاتی ہیں
کہ جیسے رفتہ رفتہ حسن کے خنجر پر دھار آئے

وہ انساں کیا جو بیگانہ ہو ذوقِ زخم و خنجر سے
وہ میکش کیا جسے صہبا کی تلخی ناگوار آئے

بتاؤں کیا تجھے حاصل فریبِ زندگانی کا
جو پایا تھا وہ کھو آئے جو جیتا تھا وہ ہار آئے

ابھی ہندوستاں میں انقلاب آیا ہے ایسا ہی
کوئی بہر دعا جیسے سرِ لوحِ مزار آئے

محبت کر چکے اب زندگی کا حشر جو کچھ ہو
یہ کشتی ڈوب جائے یا رہے، دریا کے پار آئے

نگاہیں کیا ملیں خوابیدہ اندازوں نے کروٹ لی
قیامت سو رہی تھی جیسے ہم جا کر پکار آئے

نشورؔ اب زندگی پیمائشِ غم کے سوا کیا ہے
شبِ رخصت اگر گزرے تو شامِ انتظار آئے

﴿۸۲﴾

میں نظر نظر پہ مچل گیا میں قدم قدم پہ ٹھہر گیا
تری کائناتِ شباب میں میں جواں ہو کے جدھر گیا

یہ خرامِ ناز پہ مٹ گیا وہ شباب عمر پہ مر گیا
جو جوانیوں سے گزر گیا وہ قیامتوں سے گزر گیا

دل و دلربا کا وہ ساتھ ہے کہ اُڑے تو دونوں ہی اُڑ گئے
مری آہ تا بہ فلک گئی ترا حُسن تا بہ قمر گیا

میں پرکھ رہا ہوں جمال کو مجھے خال و خط کی خبر نہیں
ترا حُسن دے کے نظر گیا ترا جلوہ لے کے نظر گیا

یہ زمیں بھی تھی یہ فلک بھی تھا مگر اِک شباب کی تھی کمی
تری زُلف تا بہ کمر گئی تو جہانِ حسن سنور گیا

ہے جمالِ یار میں جزر و مد جو مثالِ نغمۂ زیر و بم
یہ تغیراتِ شباب ہیں یہ نشہ نہیں کہ اتر گیا

مری رات آج وہ رات ہے کہ قمر نہیں کہ سحر کروں
مری رات ایک وہ رات تھی کہ سحر ہوئی تو قمر گیا

یہ محبتوں کی نظر ہے کیا کہ نشورؔ ایک نگاہ میں
جو طرب فزا تھا ابھی ابھی وہی نغمہ درد سے بھر گیا

﴿۸۳﴾

نئی دُنیا مجسّم دِل کشی معلوم ہوتی ہے
مگر اس حسن میں دل کی کمی معلوم ہوتی ہے

حجابوں میں نسیمِ زندگی معلوم ہوتی ہے
کسی دامن کی ہلکی تھرتھری معلوم ہوتی ہے

محبت اِک مسلسل بد ظنی معلوم ہوتی ہے
کہ ان سے ہر ملاقات آخری معلوم ہوتی ہے

مری راتوں کی خنکی ہے ترے گیسوئے پُرخم میں
یہ بڑھتی چھاؤں بھی کتنی گھنی معلوم ہوتی ہے

وہ اچھا تھا جو بیڑا موج کے رحم وکرم پر تھا
خضر آئے تو کشتی ڈوبتی معلوم ہوتی ہے

غریبوں کے لہو سے اس طرح سونا بناتے ہیں
یہ جنگِ عصر جنگ زرگری معلوم ہوتی ہے

یہ دل کی تشنگی ہے یا نظر کی پیاس ہے ساقی
ہر اک بوتل جو خالی ہے بھری معلوم ہوتی ہے

دَم آخر مداوائے دِل بیمار کیا معنیٰ
مجھے چھوڑو کہ مجھ کو نیند سی معلوم ہوتی ہے

دِیا خاموش ہے لیکن کسی کا دِل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

نسیمِ زندگی کے سوز سے مرجھائی جاتی ہے
یہ ہستی پھول کی اک پنکھڑی معلوم ہوتی ہے

جدھر دیکھا نشورؔ اک عالمِ دیگر نظر آیا
مصیبت میں یہ دُنیا اجنبی معلوم ہوتی ہے

﴿۸۴﴾

میں نے کبھی نظر نہ کی دلکشیِ حیات پر
میری تمام زِندگی ان کی جمالیات پر

مجھ کو حیات کے سوا چاہیئے اِک غمِ حیات
طبع غم آفریں مری رہ نہ سکی حیات پر

وہ بھی غیور و شرمگیں دل بھی نزاکت آفریں
چوٹ لگی ہے بات سے بات بڑھی ہے بات پر

چاند ہے اور چاندنی حُسن ہے اور حُسنِ یار
میرے ہزار دن نثار حُسن کی ایک رات پر

حُسن یہاں نظر فریب درد یہاں جگر گداز
ہائے کہ مٹ گیا نشورؔ جلوۂ بے ثبات پر

﴿۸۵﴾

بھلا کب دیکھ سکتا ہوں کہ غم ناکام ہوجائے
جو آرامِ دل و جاں ہے وہ بے آرام ہوجائے

محبت کیا اگر یوں صورتِ الزام ہوجائے
نظر ناکام اور ذوقِ نظر بدنام ہوجائے

قیامت ہے اگر یوں زندگی ناکام ہوجائے
وہ پہلو میں نہ ہوں اور گرمیوں کی شام ہوجائے

فضا رنگیں فضا اور شام رنگیں شام ہوجائے
وہ آجائیں تو ساری چاندنی گلفام ہوجائے

غمِ دِل ہے مگر آخر غمِ دِل کیا کہے کوئی
فسانہ مختصر ہوکر جب ان کا نام ہوجائے

محبت رو چکی اور ماتم انجام باقی ہے
وہ آنکھیں اشک بھر لائیں تو اپنا کام ہوجائے

بڑی حسرت سے انساں بچپنے کو یاد کرتا ہے
یہ پھل پک کر دوبارہ چاہتا ہے خام ہوجائے

میں ضبطِ غم میں بھی اِک کیفیت کا ذوق رکھتا ہوں
میں پی جاؤں اگر یہ اشک رنگیں جام ہوجائے

مری دُنیا کی تاریکی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے
قمر طالع ہو یا سورج قریبِ بام ہوجائے

جیا لیکن مرا جینا کسی کے بھی نہ کام آیا
میں مرتا ہوں کہ شاید زندگی پیغام ہوجائے

نشورؔ احباب خوش دل کو ذرا ہنس بول لینے دو
قیامت ہے اگر احساسِ شاعر عام ہوجائے

﴿۸۶﴾

کیا چیز ہے محبت عالم کے خشک و تر میں
رس بھر دیا ہے جس نے بیتابیِ نظر میں

جب دل کی دھڑکنوں کا پردا اٹھا کے دیکھا
ٹھیرا ہوا تھا دل اور ہر ذرہ تھا سفر میں

اس خاک کی کلی میں کل عطر آب و گل ہے
دُنیا نچوڑ لی ہے اِک خلقتِ بشر میں

دو پاک ہستیوں میں کیا چیز ہے محبت
دِل کھنچ کے آ گیا ہے دونوں طرف نظر میں

فطرت جگا رہی ہے کمسن جوانیوں کو
سویا ہوا ہے محشر اِک حُسن بے خبر میں

تم کیا گئے کہ جیسے دُنیا بدل گئی ہے
سورج وہی ہے لیکن رونق نہیں سحر میں

گہرائیوں میں دل کی بے شک اُتر گیا ہے
اِک شعر اگر کہا ہے شاعر نے عمر بھر میں

﴿۸۷﴾

محبت ہوش سے گزری تو کچھ دیوانگی آئی
جگر میں درد اٹھا اشک ٹپکے پھر ہنسی آئی

شکستِ ناز فرمائی ہے یا تکمیل رعنائی
ادائیں محوِ الفت ہوگئیں یا سادگی آئی

خدائی مل رہی تھی لیکن اس انسان نے ٹھکرایا
کچھ ایسا جلوہ لے کر اس کے آگے بندگی آئی

مجھے محسوس کرنا ہی پڑا ربطِ جمال ان کا
یہاں تک میرے نقشِ آرزو میں دلکشی آئی

تو سجدے مانگتا ہے اور میں مغرور طاعت ہوں
خدائی تجھ کو آئی اور نہ مجھ کو بندگی آئی

جہاں سے عشق نے سنجیدگی برتی غم دل میں
وہیں سے کچھ مزاج حُسن میں آشفتگی آئی

نشورؔ اِک زندگی کا تجربہ ہے شعر موزوں بھی
بہت دیکھے غمِ ہستی تو تھوڑی شاعری آئی

﴿۸۸﴾

میں شاد ہوں تو زمانے میں شادمانی ہے
شراب لاؤ کہ عالم تمام فانی ہے

تمام عالمِ ہستی پہ حکمرانی ہے
مرا جہان ہے جب تک مری جوانی ہے

رگوں میں روح ہے اور خون میں روانی ہے
نگاہ بادہ کش و چہرہ ارغوانی ہے

تغیرات کے عالم میں زندگانی ہے
شباب فانی نظر فانی حُسن فانی ہے

کہیں کہیں یہ محبت بھی غیر فانی ہے
جہاں خیال حقیقت کی ترجمانی ہے

فریب حسن و جوانی سے روکنے والے
میں کیا کروں کہ قیامت کی دلستانی ہے

ترے خیال سے ہے مستیٔ نظر میری
تری نگاہ سے میں نے شراب چھانی ہے

ترا جمال فسانوں میں رنگ بھرتا ہے
ترے شباب سے دلکش مری کہانی ہے

مری حیات میں جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
ترے بغیر بھی کیا خاک زندگانی ہے

دلِ فسردہ میں ہوتی ہے زندگی پیدا
نشورؔ جرعۂ صہبا بھی زندگانی ہے

۸۹

بے کیف شبِ مہ کی اُجالی نظر آئی
بوتل جو مئے ناب سے خالی نظر آئی

ہلکی سی جوان آنکھوں میں لالی نظر آئی
میں کیا کہوں دِل لوٹنے والی نظر آئی

محویّتِ دیدار میں آئینہ جو دیکھا
مجھ سی نہ مری شکل مثالی نظر آئی

یاد آ گئی بیتی ہوئی اِک شب کی ملاقات
لہرا گیا میں رات جو کالی نظر آئی

کعبہ میں بھی اس حسنِ ستمگار نے مارا
سجدوں میں بھی ابروئے ہلالی نظر آئی

بھیگی ہوئی زُلفوں میں وہ اترا ہوا چہرہ
ساون کی گھٹاؤں میں اُجالی نظر آئی

وہ دوش، وہ بازو، وہ سر انگشت حنائی
جو چیز تھی سانچے ہی میں ڈھالی نظر آئی

اِک صبح غم انگیز نشورؔ آئی تو جیسے
دُنیا مجھے اُمید سے خالی نظر آئی

﴿۹۰﴾

ظرفِ خیال یار بھی لبریز ہوگیا
مدّت کے بعد پی تو نشہ تیز ہوگیا

آنکھوں میں ایک رنگ گلابی سا آ گیا
چہرہ سرور جام سے گلریز ہوگیا

ہستی تمام جام میں ڈھلتی چلی گئی
عالم تمام کیف سے لبریز ہوگیا

یوں کیف مے نشاط جوانی سے مل گیا
جیسے کہ رنگ رنگ میں آمیز ہوگیا

ہر اِک نظر شباب کے جلووں میں گھر گئی
ہر منظر جمال بلا خیز ہوگیا

جیسے رگوں میں شعلۂ آتش سما گیا
جیسے نَفَس نَفَس شرر انگیز ہوگیا

﴿۹۱﴾

شوق تھا شباب کا حُسن پر نظر گئی
لُٹ کے تب خبر ہوئی زندگی کدھر گئی

بارگاہِ حسن میں جب کبھی نظر گئی
رُک گئی سنبھل گئی تھم گئی ٹھہر گئی

دیکھتے ہی دیکھتے آ گئیں جوانیاں
رس بھرا شباب میں زلف تا کمر گئی

نقطۂ نگاہ سے محشرِ خیال تک
کل تری یہ کائنات آرزو سے بھر گئی

کیوں سکوں نصیب ہیں ہجر کی درازیاں
جیسے پیاس بجھ گئی جیسے بھوک مر گئی

دیکھتے ہی دیکھتے دن گئے بہار کے
فصلِ گل بھی کس قدر تیز تر گزر گئی

زندگی قریب ہے کس قدر جمال سے
جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی

دلستانیاں بڑھیں نوجوانیاں چڑھیں
ذرّہ ذرّہ زندگی پھوٹ کر اُبھر گئی

دن بدل گئے مگر غم بدل سکا نہیں
دل رہا دلِ حزیں، چشم، چشم تر گئی

کیا خبر نشورؔ تھی منزل شباب کی
پھول لے لیا مگر نوکِ خار اُتر گئی

۹۲

ایک مست شباب باقی ہے
چلتی پھرتی شراب باقی ہے

نشۂ کامیاب باقی ہے
دورِ برف و شراب باقی ہے

خانۂ خام و گوشۂ صحرا
یارو عہدِ شباب باقی ہے

فکرِ تعمیر دو جہاں بے سود
اِک جہانِ خراب باقی ہے

حیف بیداریِ خیال و نظر
عالمِ نیم خواب باقی ہے

گیس اور بجلیوں کی حد سے دُور
اِک شبِ ماہتاب باقی ہیچ

اِک خدائے جہاں رحیم و کریم
بے گناہ و ثواب باقی ہیچ

ماورائے نشوؔر عالم خاک
ایک رنگین خواب باقی ہیچ

﴿۹۳﴾

ملاحت جوانی تبسّم اشارا
انھیں کافروں نے تو شاعر کو مارا

محبت بھی ظالم عجب بے بسی ہے
نہ وہ ہی ہمارے نہ دل ہی ہمارا

میں تنکوں کا دامن پکڑتا نہیں ہوں
محبت میں ڈوبا تو کیسا سہارا

مجھے سطحِ غم پر ابھی تیرنے دو
میں ڈوبا تو ڈوبا تغزّل کا تارا

جو بسمل بنادے وہ قاتل تبسم
جو قاتل بنادے وہ دلکش نظارا

محبت کا بھی کھیل نازک ہے کتنا
نظر مل گئی آپ جیتے میں ہارا

تمھاری اُمنگوں کا کیا پوچھنا ہے
بہاریں تمھاری گلستاں تمھارا

تمھارا نشورؔ اور تمھارا تخیّل
محبت تمھاری تو شاعر تمھارا

﴿۹۴﴾

جب سے کہ عمر آئی ہے ان کے شباب کی
دُنیا بدل گئی ہے جہانِ خراب کی

تابانیاں میں عرض کروں کیا شباب کی
سانچے میں ڈھل گئی ہے کرن آفتاب کی

تھی کمسنی تو رنگِ گلستاں تھا حسن دوست
معصومیت میں مار نہیں تھی حجاب کی

آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ
آنکھوں میں موج کھیل رہی ہے شراب کی

بازو برہنہ، زُلف مسلسل، بھویں سیاہ
آنکھوں میں کیف چال میں مستی شراب کی

اِک پیکرِ شباب کا خاموش التفات
ہونٹوں پہ جیسے مہر لگی تھی گلاب کی

شاید کسی کا دردِ محبت جگا سکے
ظالم کو نیند آئی ہے عہدِ شباب کی

﴿۹۵﴾

نظروں میں کامرانی جلووں میں حکمرانی
ہے مالکِ زمانہ اِک مالکِ جوانی

اِک فرصتِ نظارہ اِک پیکرِ جوانی
اس کے سوا دو عالم میری نظر میں فانی

یہ ممکناتِ باطل یہ کائنات فانی
ہستی سے تو بدل دے اِک لمحۂ جوانی

ساغر میں اور کچھ ہے آنکھوں میں اور ہی کچھ
وہ مستیٔ زمانہ یہ مستیِ جوانی

ظالم شراب بھی ہے کتنی لطیف تر شے
دو گھونٹ پیتے پیتے چہرہ ہو ارغوانی

اے زندگی سے غافل ہے زندگی بس اتنی
دو ایک لمحہ بچپن دو چار دن جوانی

﴿۹۶﴾

پھاگن میں بھی جو ابر اُٹھا اور چھا گیا
میں کیا کہوں کہ کون مجھے یاد آ گیا

جلووں کا انتشار نگاہوں پہ چھا گیا
موسم کا انقلاب رگوں میں سما گیا

اب کیا ہے ان کے حُسن کی تخئیل کے سوا
عالم تمام ان کی جوانی میں آ گیا

پھولوں سے میں بچا نہ سکا اپنے آپ کو
کانٹوں سے تو نشورؔ میں دامن بچا گیا

﴿۹۷﴾

میں بے نیازِ رنگ ہوں رنگِ جہاں سے دُور
گل سے الگ چمن سے جدا گلستاں سے دُور

تھوڑی سی میکدے کے لیے چاہئے زمیں
دُنیا کے اس بنائے ہوئے آسماں سے دُور

میں جلوۂ تمام ہوں میں غفلتِ مدام
سارا سماں مجھی میں مگر میں سماں سے دُور

یوں آ رہا ہے عہدِ گزشتہ کا کچھ خیال
جیسے کوئی ستار بجائے یہاں سے دُور

چوکھٹ سے آبرو ہے جبینِ نیاز کی
سجدہ کہاں رہے گا ترے آستاں سے دُور

﴿۹۸﴾

دُنیائے رنگ و بو سے گزرتا ہوں میں کبھی
رنگینیٔ شباب پہ مرتا ہوں میں کبھی

پھولوں کو چھو کے آہ سی بھرتا ہوں میں کبھی
دِل کی نزاکتوں سے گزرتا ہوں میں کبھی

نظارۂ جمال کے نزدیک ٹھیر کر
بے تابیٔ نگاہ سے ڈرتا ہوں میں کبھی

جیسے کہ اِک نمود سی باقی ہے کچھ ابھی
آشفتہ حالیوں میں سنورتا ہوں میں کبھی

میرے تخیلات کو چنتی ہے کائنات
عالم میں پھول بن کے بکھرتا ہوں میں کبھی

مجھ میں بھی اِک کشش ہے انھیں کے جمال کی
ان کی تجلّیوں سے نکھرتا ہوں میں کبھی

دنیائے شعریت لیے شاعر کی شکل میں
ہر دل کی چوٹ بن کے ابھرتا ہوں میں کبھی

بوتل کی مے نشورؔ گراتے ہوئے تمام
پیمانہ چشمِ مست سے بھرتا ہوں میں کبھی

قامت دِلربا پر شباب آ گیا
یا سوا نیزے پر آفتاب آ گیا

جاگی جاگی ان آنکھوں کا عالم نہ پوچھ
سامنے ایک جامِ شراب آ گیا

اِک نگاہِ محبت کی تخمیر میں
سب سمٹ کر جہانِ خراب آ گیا

یہ چلے وہ بڑھے وہ جواں ہوگئے
چند لمحوں میں یوم الحساب آ گیا

جھوم اُٹھی ایک ارماں بھری زندگی
جب ہوائیں چلیں جب سحاب آ گیا

آیئے آیئے اس طرف وہ نشؔور
شاعرِ یادگارِ شباب آ گیا

آغوش رنگ و بو کے فسانے میں کچھ نہیں
حسرت نکل گئی تو زمانے میں کچھ نہیں

مایوسیوں میں حُسن بھی روشن نہیں رہا
دِل بجھ گیا تو شمع جلانے میں کچھ نہیں

ساقی کے کیفِ بادۂ پارینہ کی قسم
سائنس کے جدید خزانے میں کچھ نہیں

اِک حسن نیم خواب کا عالم ہی اور ہے
سوئی ہوئی ادا کو جگانے میں کچھ نہیں

فطرت نئی، زمانہ نیا، زندگی نئی
کہنہ خدا کو پوجتے جانے میں کچھ نہیں

تیرا ہی ایک عکس تھا ہر سو نظر فریب
دیکھا تو میرے آئینہ خانہ میں کچھ نہیں

کچھ ذکر جام و شاہد و مے کیجئے نشورؔ
ہوش و خرد کے سرد فسانے میں کچھ نہیں

﴿۱۰۱﴾

زندگی ایک راز ہے پیارے
اختلافِ مجاز ہے پیارے

خلق آلودۂ گناہ سہی
زندگی پاکباز ہے پیارے

زندگی دل شکن نہیں ہوتی
زندگی دل نواز ہے پیارے

روح کو جسم سے الگ کرنا
یہ بھی اِک امتیاز ہے پیارے

ان کی زُلفِ دراز جب تک ہے
زندگی بھی دراز ہے پیارے

۱۰۲

ہاتھ سے دُنیا نکلتی جائے گی
اور دُنیا ہاتھ ملتی جائے گی

حُسن کی رنگت بدلتی جائے گی
یہ شبِ مہتاب ڈھلتی جائے گی

مُنقلب ہوتی رہیں گی فطرتیں
زندگی کروٹ بدلتی جائے گی

ختم ہوسکتی نہیں سیرِ حیات
زندگی رُک رُک کے چلتی جائے گی

نوجوانی آرزوئیں سب لیے
گرتی جائے گی سنبھلتی جائے گی

عشق غافل زخم کھاتا جائے گا
حسن کی تلوار چلتی جائے گی

یوں ہی اِک ارماں نکلتا جائے گا
یوں ہی اِک حسرت مچلتی جائے گی

یوں ہی آتی جائے گی شامِ وصال
یوں ہی شمعِ بزم جلتی جائے گی

یوں ہی رخصت ہوتی جائے گی خوشی
یوں ہی صبحِ غم نکلتی جائے گی

یوں ہی گائے جائیں گے شعرِ نشورؔ
یوں ہی طبعِ غم بہلتی جائے گی

جب ظلمتیں شعاعِ بداماں سی ہوگئیں
آنکھیں کسی کی کھل کے پشیماں سی ہوگئیں

رعنائیاں تمام نمایاں سی ہوگئیں
زُلفیں کھلیں تو کھل کے پریشاں سی ہوگئیں

برہم نگاہیوں نے جو اپنے پہ کی نظر
شمعیں حیا کی رُخ پہ فروزاں سی ہوگئیں

بہکے ہوئے شباب کی بے تابیاں تمام
کپڑوں کی سمٹوں سے نمایاں سی ہوگئیں

کچھ ماجرائے شوق کے رنگیں خیال سے
نظریں ملیں تو مل کے گریزاں سی ہوگئیں

جب سے کہ رُت بسنت کی جاڑوں میں آئی ہے
سرسوں کے ساتھ دِل کی فضا لہلہائی ہے

یہ امتزاجِ حُسن دو عالم دہائی ہے
بدلی بھی چھائی اور جوانی بھی چھائی ہے

سرتا قدم شباب کی تنویر چھائی ہے
جیسے کہ آب و گل میں کرن پھوٹ آئی ہے

تاب نظارۂ گل و گلشن نہیں مجھے
جیسے کہ چوٹ میں نے تبسّم سے کھائی ہے

ہر جلوہ کائنات کا محوِ سجود ہے
میں تو یہی کہوں گا جوانی خدائی ہے

دِل میں نہیں تڑپ تو نگاہوں میں کچھ نہیں
دِل کی تجلّیوں سے نظر جگمگائی ہے

﴿۱۰۵﴾

یوں ہی ٹھہر ٹھہر کے میں روتا چلا گیا
موتی سنبھل سنبھل کے پروتا چلا گیا

سانچوں میں حسن و نور کے ڈھلتا گیا شباب
سرتا قدم شراب ہی ہوتا چلا گیا

دشمن نے میری راہ میں کانٹے بچھا دئے
اور میں اُٹھا تو پھول ہی بوتا چلا گیا

ہر نقش آرزو جو بعنوانِ ہوش تھا
جیسے کوئی شراب سے دھوتا چلا گیا

جھولا جھلا رہی تھی مجھے دِل کی آرزو
سب جاگتے تھے اور میں سوتا چلا گیا

رنج و ملال و کیف و نشاط و بہارِ عمر
جو کچھ مجھے ملا اُسے کھوتا چلا گیا

غم کا خموش نغمۂ دلسوز بھی نشورؔ
اِک کیف سا رگوں میں سموتا چلا گیا

﴿۱۰۶﴾

رنگ یہاں بہت مگر رنگ سے کام بھی نہیں
تیری یہ بزمِ آب وگل دِل کا مقام بھی نہیں

بس کہ کہیں نہ جاگ اُٹھیں سوئی ہوئی قیامتیں
یہ تو خرامِ حشر ہے حشر خرام بھی نہیں

میری نمازِ کیف میں سجدہ کہاں رکوع کیا
ساقی مست کی قسم ہوشِ امام بھی نہیں

حُسن تمام گفتگو عشق تمام خامشی
رفعِ شکوک بھی نہیں قطعِ کلام بھی نہیں

مے سے اگر گریز ہے سجدہ تو خُم کو کیجئے
بادہ حرام ہو تو ہو سجدہ حرام بھی نہیں

کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات

شوقِ شباب نو بہ نو ذوقِ گناہ دَمبدم
عمر تمام ہو تو ہو لطفِ تمام بھی نہیں

جلوۂ حسن مضطرب، نورِ نگاہ بے قرار
آنکھ کہاں ٹھہر سکے حسن مقام بھی نہیں

کوئی بھی ہو لگائے دِل کوئی بھی ہو جلائے دل
عشق کی بارگاہ میں منعِ عوام بھی نہیں

جب بھی ہو مجھ کو ہوشِ مے بس ہے وہی سحر مری
زندگی صبح بھی نہیں زندگی شام بھی نہیں

آپ کی زندگی نشورؔ آپ کی شاعری نشورؔ
حُسن تمام حُسن ہے صوت و کلام بھی نہیں

فَروغِ جَام

۱۹۴۷ء

سے

۱۹۵۷ء

تک

۱۰۷

ہمہ گریہ سلک شبنم، ہمہ اشک بزم انجم
جو نہ گل بھی مسکرائے، تو کہاں رہے تبسّم

نہ مجال عرض شکوہ، نہ اجازت تکلّم
تری زندگی خموشی، مری زندگی تلاطُم

نہ خطا مری نظر کی، نہ گنہ ترے کرم کا
کہ نصیب عاشقاں ہے یہ شکستِ بے تصادم

مری حسرتیں پشیماں، مری کروٹیں غم آگیں
تری رات رنگ و نکہت، تری نیند ماہ و انجم

تھی بھری بہار لیکن، گل و بوئے گل نے سمجھا
نگہِ چمن سے چھپ کر، جو کبھی ملے ہیں ہم تم

کہیں برق جگمگائی، کہیں پھول مسکرائے
جو ترے لبوں کو چھوکر، ہوا منتشر تبسّم

کوئی راہ ہے محبت، تو ہجوم ہے جوانی
کہیں پاؤں ڈگمگائے، کہیں زندگی ہوئی گم

یہ ادائے ملتفت ہے، کہ حجاب کم نگاہی
ترے رُخ پہ رنگ رُخ کا، یہ تھکا تھکا تلاطم

کہیں مل گئے کنارے، رہ و رسم آرزو کے
غمِ دل کو چھو رہا ہے، یہ سکوتِ پرُ تکلّم

جسے غم سے کچھ ملا ہے، وہی ہم نفس ہے میرا
جو شکستہ سازِ دِل ہو، تو سنو مرا ترنّم

یہ سمجھ لو زندگی ہے، سفرِ ہزار جادہ
غمِ کارواں سے چھوٹے، تو نشورؔ کھو گئے تم

﴿۱۰۸﴾

یہ نظم گریزاں ہے، برہم زدنی پہلے
زاہد کی طرف سے ہو، توبہ شکنی پہلے

پھولوں کے تبسّم پر، رونا ابھی آتا ہے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے، ویراں چمنی پہلے

یوں حُسن کے چہرے پر آئی نہیں برنائی
سَو شام کے پردوں میں، اک صبح چھنی پہلے

اب حُسن کی فطرت بھی شبنم سی انیندی ہے
صد خواب گلستاں تھی گل پیرہنی پہلے

معلوم کسے آخر اس خاک تمنّا سے
پردا نہ اُٹھا پہلے، یا شمع بنی پہلے

یہ عیش کے ہنگامے، اُڑتے ہوئے بادل ہیں
ہوتی ہے نگاہوں میں ہر چھاؤں گھنی پہلے

تسخیر جہاں اکثر، تہذیبِ جنوں میں ہے
عالم شکنی چاہے، کر خود شکنی پہلے

انعامِ عمل شاید، کچھ یوں ہی مقرر ہے
گل پیرہنی آخر، رنگیں کفنی پہلے

اِک نیم تبسّم سے ہوتا ہے چمن زندہ
عیسیٰ نفسی سیکھے، غنچہ دہنی پہلے

بے مہریِ ساقی کی تخلیق ہے ہشیاری
میخانہ میں زاہد کی توبہ بھی بنی پہلے

ہر نغمہ نشورؔ اب بھی ممنونِ تغزّل ہے
سکھلائی غزل نے ہی شیریں سخنی پہلے

۱۰۹

یہ نیم باز تری انکھڑیوں کے میخانے
نظر ملے تو چھلک جائیں دِل کے پیمانے

شرابِ شوق سے بوجھل لبوں کے پیمانے
تری نگاہ کو ایسے میں کون پہچانے

کہیں کلی نے تبسُّم کا راز سمجھا ہے
جو خود چمن ہے وہ اپنی بہار کیا جانے

عجب نہیں جو محبت مجھے سمجھ نہ سکے
وہ اجنبی ہوں جسے زیست بھی نہ پہچانے

جو ہوش میں تھا تو کوئی نہ مے بہ جام آیا
بہک گیا ہوں تو دُنیا چلی ہے سمجھانے

یہیں سجودِ محبت کی بستیاں تھیں کبھی
بتا رہے ہیں یہ دیر وحرم کے ویرانے

کہیں چراغ جلانے کی ہورہی ہے سبیل
بُجھا رہے ہیں یہاں شمع خود ہی پروانے

فریبِ مشرق و مغرب ہیں رہروانِ جدید
یہ بد نصیب نہ عاقِل ہوئے نہ دیوانے

وہ زندہ ہے جو بہے موجِ وقت کی رَو میں
وہ زندہ تر ہے جو طوفاں میں ٹھیرنا جانے

میں اپنی بزم سے اتنا ہی دُور ہوں کہ نشورؔ
مری نواؤں سے کچھ آشنا ہیں بیگانے

﴿۱۱۰﴾

نگاہ حاصلِ رعنائیِ دو عالم ہے
وصال اگر نہیں ممکن نظارہ کیا کم ہے

ترا وجود خود اِک سجدۂ مجسّم ہے
نہ زندگی ہے زیادہ نہ بندگی کم ہے

وہ ایک قطرہ جو آنکھوں کا رنگ لے کے گرے
ہزار عالمِ رنگیں کا ایک عالم ہے

جہاں میں رہ کے ترا سجدہ بھول سکتا ہوں
ابھی ٹھہر کہ جبینِ نیاز برہم ہے

عنایتوں سے غمِ آرزو بدل نہ سکا
لچک رہی ہے تجلّی نگاہ محکم ہے

گنہ گنہ سے نیا اِک جہان پیدا کر
نئی رگیں ہیں جوانی ہے خونِ آدم ہے

نظر میں کیف بھی ٹھہرے تو بارِ غم ہے نشورؔ
خوشی وہی ہے یہاں جس کی زندگی کم ہے

۱۱۱

دِل کی تصویر حسن و رعنائی
سطح پر آگئی ہے گہرائی

شامِ غم اور ملالِ تنہائی
بڑی مشکل سے رات نیند آئی

پھول نے بھی ترے گلستاں سے
دِل نہ پایا تو دلکشی پائی

ارتباطِ حیات بھی دیکھا
ایک محفل ہزار تنہائی

پھیکا پھیکا سا ہے تبسُّم گُل
جیسے کھِل کر بہار پچھتائی

حُسن اِک ناتمام سا اقدام
عشق اِک کامیاب پسپائی

اِک نفَس وہ بھی غیر کا ممنون
زیست اس زندگی سے شرمائی

توبہ و جام و نرگس مخمور
مجھ سے پہلے شراب تھرّائی

دیکھتا ہوں نشورؔ شعروں میں
دِل کی گیرائی غم کی گہرائی

﴿۱۱۲﴾

غمِ خاموش جو با اشکِ چکاں رکھتا ہوں
ایک ٹھہرے ہوئے دریا کو رواں رکھتا ہوں

اِک بدلتی ہوئی دُنیا کا سماں رکھتا ہوں
اُن کی جانب سے محبت کا گماں رکھتا ہوں

شوق تازہ ہو کہ ہو حسرتِ بالیدہ کوئی
کچھ نہ کچھ سِلسِلۂ آہ و فغاں رکھتا ہوں

پسِ مژگاں وہ چُرائے ہوئے آنسو کی قسم
اُن کے دامن پہ غمِ دل کا نشاں رکھتا ہوں

کچھ جھجکتی ہوئی نظریں ہیں خریدارِ جمیل
میں بھی پلکوں پہ ستاروں کی دکاں رکھتا ہوں

منتظر ہیں حرم و دیر کے گوشے یعنی
میں نے جو شمع جلائی ہے کہاں رکھتا ہوں

مصلحت ہے کہ ترا تیر نہ خالی جائے
ورنہ مٹّھی میں اِرادوں کی کماں رکھتا ہوں

غیر کے ہاتھ میں آزادیٔ روشن کا چراغ
میں فقط مردہ چراغوں کا دُھواں رکھتا ہوں

داغ ہوں لالۂ اقوام جہاں کے دل کا
میں بہاروں کے کلیجے پہ خزاں رکھتا ہوں

تیری بخشی ہوئی آزاد جبیں کی سَوگند
ایک سجدہ بھی غلامی میں گراں رکھتا ہوں

کوئی منزل ہو مجھے آبلہ پائی سے ہے کام
کچھ زمیں کہتی ہے میں پاؤں جہاں رکھتا ہوں

انقلابات و عزائم کے سنورنے کے لیے
ایک آئینہ پسِ لفظ و بیاں رکھتا ہوں

میری دُنیا میں نہ کعبہ ہے نہ بت خانہ نشورؔ
دِل کے گوشے میں مگر دَیرِ مغاں رکھتا ہوں

﴿۱۱۳﴾

پنکھڑی ایک گلستاں سے صبا کیا لائی
دُور تک نکہتِ گل خاک اُڑاتی آئی

اُف وہ بیگانہ نگاہوں کی کرم فرمائی
فطرتِ عشق بہ انداز جنوں تھرائی

تازہ تازہ وہ شکستِ سخن رعنائی
چُپ ہوئے وہ تو تبسُّم کی جھلک سی آئی

آخرِ شب وہ ستاروں کی سرکتی ہوئی چھاؤں
مَیں وہیں بیٹھ گیا رات جہاں لہرائی

جاگی جاگی ہوئی پلکیں وہ بہ آغوشِ جمال
دل کو آرام زیادہ تھا تو کم نیند آئی

وقت نے ظرفِ نظر کو لبِ مے خوار کیا
تشنگی شیشہ کو پیمانہ بنا کر لائی

زندگی ایک ہجوم گزراں ہے لیکن
آدمی اپنی جگہ عالمِ صد تنہائی

اپنے ہی شعلۂ رنگیں سے جَلا دامن گل
اپنی ہی شاخ تبسُّم پہ کلی مُرجھائی

منزلِ عقل جنوں رنگ اسے ملتی ہے
جس نے اِک بار رہ عشق میں ٹھوکر کھائی

پتّے پتّے کا نہیں گلشن عالم میں جواب
ذرّہ ذرّہ میں دھڑکتا ہے دلِ یکتائی

ٹوٹتی سی رگِ دوراں یہ ترقی کی تھکن
کسی معشوقِ سحر خیز کی نیم انگڑائی

خاک اور خون سے اِک شمع جلائی ہے نشورؔ
موت سے ہم نے بھی سیکھی ہے حیات آرائی

محفلِ انساں میں کیوں بے رونقی پاتا ہوں میں
زندگی خالی ہے اور دُنیا بھری پاتا ہوں میں

ہر تبسُّم میں تعلّق کی کمی پاتا ہوں میں
ہر ادا آرائشِ بیگانگی پاتا ہوں میں

گل تبسُّم ریز ہیں لیکن چمن افسردہ ہے
شمع جلتی ہے مگر محفل بجھی پاتا ہوں میں

جل رہا ہے کس جگہ شامِ غریباں کا لہو
دُور تک پھیلی ہوئی اِک روشنی پاتا ہوں میں

نازِ حُسنِ دوست میں بیتاب ہے اِک آرزو
دِل کا اِک عالم بہ قیدِ دلبری پاتا ہوں میں

روح کی وہ جلوہ سامانی نہیں ممکن نشورؔ
زندگی جب خود برائے زندگی پاتا ہوں میں

چمن کو خار و خسِ آشیاں سے عار نہ ہو
کہیں گزشتہ بہاروں کی یادگار نہ ہو

چمک رہا ہے اندھیرے میں کاروبارِ حیات
نظر، نظر ہو تو جینا بھی سازگار نہ ہو

یہ زلف و رُخ، یہ شب و روز، یہ بہار و خزاں
وہ سلسلہ ہے کہ قطع نظر بھی بار نہ ہو

بہار کچھ جو ملی رنگ و بو سے بیگانہ
وہ آ گئے کہ عناصر میں انتشار نہ ہو

یہ تار و پودِ نظامِ خرد بکھر کے رہے
جنوں بقدرِ تجلّی جو ہوشیار نہ ہو

یہ ڈر رہا ہوں میں تکرارِ موسمِ گل سے
مِٹا ہوا کوئی عالم پھر آشکار نہ ہو

یہ آرزو ہے کہ خوش فہمیِ طلب ہے نشورؔ
اُمید کیا ہے جو دُنیا اُمید وار نہ ہو

۱۱۶

حُسن جتنا ہی سادہ ہوتا ہے
گیسوئے ناکشادہ ہوتا ہے

عشق اِک ربطِ سادہ ہوتا ہے
محشرِ بے ارادہ ہوتا ہے

جب کبھی شغلِ بادہ ہوتا ہے
ایک عالم زیادہ ہوتا ہے

جب وہ آتے ہیں زندگی کے قریب
دل بھی دُور اُفتادہ ہوتا ہے

کیا خبر یہ فِشُردۂ انگور
کتنا خوں ہو کے بادہ ہوتا ہے

مرگ کرتی ہے جب کہ دربانی
زیست کا در کشادہ ہوتا ہے

اُن کا جلوہ نہ دُور ہے نہ قریب
نور ہے کم زیادہ ہوتا ہے

راہِ احساسِ بےکسی مت پوچھ
کوئی منزل نہ جادہ ہوتا ہے

حُسن ہوتا ہے سادہ و رنگیں
عشق رنگین و سادہ ہوتا ہے

گنگناتا ہوں فرصتوں میں نشورؔ
شعر تنہائی زادہ ہوتا ہے

﴿۱۱۷﴾

میکدہ آج سے ہے مِلکِ عوام اے ساقی
ایک جام اور دے جمہور کے نام اے ساقی

کون لالے کی طرح داغِ جگر رکھتا ہے
کون لے تازہ بہاروں کا سلام اے ساقی

کوئی آنسو کوئی شبنم کوئی آکاش کی بوند
کوئی قطرہ نہیں دریا کا غلام اے ساقی

مے تو ہے ایک مگر ہوتی ہے تقسیم کے بعد
ساغرِ شیخ و برہمن میں حرام اے ساقی

نہ پیالوں میں شراب اور نہ محفل میں چراغ
تو نے دیکھی ہے غریبوں کی بھی شام اے ساقی

اور ہوں گے جنھیں صہبا کا تقاضا ہوگا
ہم کو خالی ہی پیالے سے ہے کام اے ساقی

شور ہر سمت ہے جمہور کی آزادی کا
مے اُبلتی ہے اگر ہوتی ہے خام اے ساقی

ہیرے اور شیشے کا مول ایک ہے بازاروں میں
جوہری ہوں تو جواہر کے ہیں دام اے ساقی

﴿۱۱۸﴾

وہ خزاں ہو یا کہ بہار ہو تجھے جاگنے کا پیام ہے
کہیں سوگیا ہو جو باغباں تو چمن کی نیند حرام ہے

یہ تھکا تھکا ہوا کارواں نہیں آشنائے سُبک روی
تو سنبھل سنبھل کے قدم اُٹھا کہ زمانہ تیز خرام ہے

ترے ماہ و مہر حیات کو نہ طلوع ہے نہ غروب ہے
تو زمانۂ اَبدُ اللّٰہی نہ تری سحر ہے نہ شام ہے

دِل عاشقانِ رضا طلب صنم آشنا ہی سہی مگر
تری مسجدوں کا یہ برہمن مرے بت کدے کا امام ہے

کسی آستیں میں لہو چھپے وہ ندا ہے بختِ سیاہ کی
یہ کرن پکار کے کہہ گئی کہ شفق کے بعد ہی شام ہے

وہ جنازہ کوئی اُٹھا سکے کہ پیالہ کوئی بڑھا سکے
جو کسی کے ہاتھ سے مل سکے وہی پھول ہے وہی جام ہے

﴿۱۱۹﴾

زاہد اسیرِ گیسوئے جاناں نہ ہوسکا
جو مطمئن ہوا وہ پریشاں نہ ہوسکا

قیدِ خودی میں آدمی انساں نہ ہوسکا
ذرّہ سمٹ گیا تو بیاباں نہ ہوسکا

دامن تک آ کے چاک گریباں بھی رہ گیا
اندازۂ بہارِ گلستاں نہ ہوسکا

خونِ دِل و جگر نہ تبسُّم بنا نہ اشک
مضمونِ آرزو کوئی عنواں نہ ہوسکا

مرنا تو ایک بار ہوا سہل بھی مگر
جینا جسے کہیں کبھی آساں نہ ہوسکا

بڑھتا ہی جارہا ہے زمانے کا اضطراب
دُنیا کے درد کا کوئی درماں نہ ہوسکا

مستقبل حیات کے عرفاں سے میں نشورؔ
اس دَورِ پُر فریب کا انساں نہ ہوسکا

۱۲۰

بِنا کعبے کی بُت خانے نے ڈالی
بُتوں نے پھر تری دُنیا سنبھالی

چمن کا سبزۂ خوابیدہ ہوں میں
مُبارک مجھ کو دورِ پائمالی

شکستِ زندگی بھی مصلحت ہے
خضر نے پھر یہ کشتی توڑ ڈالی

چمن پر ہنس رہے ہیں غنچہ و گل
کہاں سوتے ہیں اس گلشن کے مالی

مرے سینے میں ہے جوشِ عزائم
بہ اندازِ ہجوم خستہ حالی

یہ بازو انقلابات آزما ہیں
زوال آ گہ ہے میری لا زوالی

سیاست ایک دورِ برق و باراں
محبت ایک ذوقِ لایزالی

چمن زاروں میں پھر روتی ہے شبنم
بہ اشکِ دیدۂ اقبالؔ و حالیؔ

نشورؔ آمادۂ فریادِ نو ہے
مرا دِل ہو کے اُمیدوں سے خالی

﴿۱۲۱﴾

رَگ رَگ سی ٹوٹتی ہے محبت[1] میں رات کی
انگڑائیوں میں کتنی تھکن ہے حیات کی

نظروں میں ہے شراب دو گونہ ملی جلی
کچھ زندگی کی کچھ کشش بے ثبات کی

میں چُپ رہا تو وہ بھی تکلّف سے چپ رہے
میں نے جو بات کی تو تغافل نے بات کی

زُلفِ سیاہ تا کمر و دوش منتشر
جیسے کوئی دراز حکایت ہو رات کی

جب تلخیٔ شباب میں آیا ترا خیال
شاخیں لچک لچک سی گئی ہیں نبات کی

[1] مجموعۂ کلام سوادِ منزل میں یہ مصرع اس طرح ہے، ''رگ رگ سی ٹوٹتی ہے شبِ غم میں رات کی''

رقصاں ہے جیسے میرے دلِ مضطرب کے پاس
گل پیرہن سی ایک تمنّا حیات کی

وقتِ سحر خمارِ مئے و جام کچھ نہ پوچھ
دن کو مزا نہیں ہے حکایت میں رات کی

مستی بھی اِک خُمار ہے آلام کا نشورؔ
ہستی بھی اِک ادا ہے غمِ کائنات کی

۱۲۲

زِندگی راہ بے راہ چلتی رہی
ٹھوکریں کھا کے دُنیا سنبھلتی رہی

بزم خود کام تھی مُنتشِر ہوگئی
شمع بے لوث جلتی تھی جلتی رہی

رات کے قافلے دُور پہنچے کہیں
صبح مخمور تھی آنکھ ملتی رہی

کتنی بے درد تھی محفلِ رنگ و بو
غم برستا رہا مے اُبلتی رہی

لغزشوں کو مواقع ملے زیست کے
حادثے سوگئے موت ٹلتی رہی

کچھ لہو کچھ شفق کچھ کواکب بنی
میری شامِ الم رُت بدلتی رہی

میری دیوانگی میری فرزانگی
انقلاب و عزائم میں پلتی رہی

موج مردہ تھی گرداب خوابیدہ تھا
ناؤ کاغذ کی تا دیر چلتی رہی

زندگی کیا نشورؔ اپنی گزری یہاں
سانس چلنی تھی رُک رُک کے چلتی رہی

﴿۱۲۳﴾

تجلّیوں سے غمِ اعتبار لے کے اُٹھا
سُکوں نہیں تھا تو دِل کا قرار لے کے اُٹھا

چمن میں غم کی بہاریں گزار دیں میں نے
وہاں سے اپنے نشیمن کے خار لے کے اُٹھا

کیے جنوں میں یہاں تک سجودِ مجبوری
کہ آستاں سے ترے اختیار لے کے اُٹھا

گزرنے والے مسافر سے کیا امیدِ وفا
ہر ایک رہ سے کوئی انتظار لے کے اُٹھا

خزاں نصیب ہے دنیا اسے خبر کیا ہے
بہار لے کے جو بیٹھا بہار لے کے اُٹھا

چمن سے کیوں نہ تعلق ہو صورتِ شبنم
وہ گر پڑا جو علائق کا بار لے کے اُٹھا

حیات خیز ہے ہر رنگ میں ثباتِ نشورؔ
جو سنگ ہو کے بھی بیٹھا شرار لے کے اُٹھا

۱۲۴

فکرِ نوَ ذوقِ تپاں سے آئی ہے
گرد تھوڑی کارواں سے آئی ہے

زندگی پرچھائیاں اپنی لیے
آئینوں کے درمیاں سے آئی ہے

سیکھ کر جادو وہ چشمِ مے فروش
محفل جادوگراں سے آئی ہے

رات کے افسوں جگاتے ہی رہے
نیند اپنی داستاں سے آئی ہے

ہو لیے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ
یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے

یا جوانی چھو رہی ہے چاند کو
یا محبّت کہکشاں سے آئی ہے

تھا ابھی جاری بیان زندگی
موت اُٹھ کر درمیان سے آئی ہے

داغہائے سینہ میں یہ تازگی
التفاتِ ناگہاں سے آئی ہے

کیا خبر تجھ کو اسیرِ نوَ بہار
کتنی رعنائی خزاں سے آئی ہے

انقلاب نوَ میں یہ قوّت نشورؔ
میرے دستِ ناتواں سے آئی ہے

﴿۱۲۵﴾

نظمِ شراب خانہ تو برہم نہ ہوسکے
ساقی کوئی ہو فیضِ نظر کم نہ ہوسکے

آنسو چمک اُٹھے ترے دامن سے دُور دُور
تارے بنے وہ اشک جو شبنم نہ ہوسکے

رندانِ مے پرست کی کم فرصتی نہ پوچھ
اکثر شریکِ بزم دو عالم نہ ہوسکے

اے کم نصیب لذّتِ آلام روزگار
غم اس لیے دیا کہ تجھے غم نہ ہوسکے

روح بہار و نور کواکب ، رمِ حیات
انساں نہ ہو تو حسن مجسّم نہ ہوسکے

مے خانۂ نشاط کے یہ رِندِ کم نگاہ
اُٹھے تھے جام لے کے مگر جم نہ ہوسکے

اب غم کو جستجو ہے اِک ایسی نگاہ کی
جو اُن کے التفات کا عالم نہ ہوسکے

شاعر کی زندگی جو نہ ہو دل شکن نشوؔر
سامانِ اشک و آہ فراہم نہ ہوسکے

﴿۱۲۶﴾

نظارہ ان کی تجلّی کے ماسوا بھی نہیں
نگاہ کھو بھی گئی اور کچھ مِلا بھی نہیں

فریبِ ہوش کا یہ دن تمام ہونے دے
چراغ دیرِ محبت ابھی جلا بھی نہیں

سموم گرم سے میں گُل کھِلا کے دیکھوں گا
مری خزاں کو بہاروں کا آسرا بھی نہیں

مٹے ہوؤں کے فسانے چمک رہے ہیں تمام
زمانہ اپنے شہیدوں کو بھولتا بھی نہیں

تجلّیوں نے جہاں رکھ دیا ہو آئینہ
نگاہ پھیر لے یہ جرأتِ حیا بھی نہیں

غموں کی رات میں سامانِ روشنی ہے نشورؔ
یہ اِک ستارۂ مژگاں جو ڈوبتا بھی نہیں

﴿۱۲۷﴾

گناہ گار تو رحمت کو مُنھ دِکھا نہ سکا
جو بے گناہ تھا وہ بھی نظر مِلا نہ سکا

طرب ہے شیوۂ رندانِ عاقبت نہ شناس
جو گل نہ تھا وہ گلستاں میں مسکرا نہ سکا

بہ زعمِ سجدہ چمکتی ہے کچھ جبینِ نیاز
وہ بے خبر ہے جو سجدے سے سر اُٹھا نہ سکا

بہت خفیف ہے کون و مکاں کی جلوہ گری
مری نگاہ کا گوشہ بھی جگمگا نہ سکا

صبا کا کام ہے تفریحِ رنگ و بوئے چمن
کہ دِل حجابِ گلستاں کی تاب لا نہ سکا

حوالۂ نگہِ شرمگیں ہوئیں آخر
وہ بجلیاں جو کہیں آسماں گرا نہ سکا

بدیعہ کار ہے ذہنِ خرد پسند مگر
تصوّرات سے تصویرِ غم بنا نہ سکا

عجب نہیں کہ گلستاں میں پا بہ گل رہ جائے
وہ بد نصیب جو رمزِ خرام پا نہ سکا

جیا وہ پاک جو رکھتا تھا خارِ پیراہن
جو گل بہ جیب تھا دامن کبھی بچا نہ سکا

نشورؔ نازکیِ طبعِ شعر کیا کہئے
جہاں میں رہ کے زمانے کے ناز اُٹھا نہ سکا

﴿۱۲۸﴾

پیراہنِ رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے
معصوم ہے کیا جانے دامن کہیں جلتا ہے

میری مژۂ غم پر لرزاں ہے حقیقت سی
ان کے لبِ لعلیں پر افسانہ مچلتا ہے

اچھی ہے، رہے تھوڑی یہ جلوہ طرازی بھی
رقصِ مہ و انجم میں دیوانہ بہلتا ہے

عنوان ترقی ہے یہ تیرہ فضائی بھی
کچھ گرد بھی اُٹھتی ہے جب قافلہ چلتا ہے

ہے شام ابھی کیا ہے بہکی ہوئی باتیں ہیں
کچھ رات ڈھلے ساقی میخانہ سنبھلتا ہے

بس دیکھ چکی دُنیا یہ بزم فروزی بھی
رکھّا ہے چراغ ایسا بجھتا ہے نہ جلتا ہے

اِک سحر شبستاں ہے یہ فنِّ جہاں رانی
دُنیا ہے کہ سوتی ہے جادو ہے کہ چلتا ہے

افلاس کے آنسو سے طوفاں بھی لرزتے ہیں
شعلوں کا جگر گویا شبنم سے دہلتا ہے

مطرب بہ لبِ لعلیں، ساقی بہ مے و مینا
اس گرمیٔ محفل میں ایمان پگھلتا ہے

دیکھا ہے نشور اُن کو غم دیدہ و نم دیدہ
فطرت بھی بدلتی ہے شاعر بھی بدلتا ہے

﴿۱۲۹﴾

لذّتِ غم اگر کوئی جانے
صورتِ زندگی نہ پہچانے

جاگنے والوں کو سلا نہ سکے
گیسوؤں کے دراز افسانے

دامنِ شبنمِ سحر گاہی
لالۂ و گل کی آنچ کیا جانے

آج وہ مالکِ تمنّا ہیں
جن کو ٹھکرا دیا تھا دُنیا نے

انقلابات نے پُکار دیا
نیند کب ٹوٹتی خدا جانے

ہم ہیں آوارۂ حدودِ جمال
رہبرِ قوم کیوں بُرا مانے

کوکبِ چشمِ آگہی ہیں نشورؔ
ٹوٹتے موتیوں کے یہ دانے

﴿۱۳۰﴾

دُنیا کو خبر کیا کہ کسی سادہ ادا نے
اشکِ پسِ مژگاں سے بدل ڈالے زمانے

خود جل کے مرتّب کئے محفل کے فسانے
پروانوں کو دعوتِ ہی نہ دی شمعِ حیا نے

رستہ وہی شاداب ملا لالہ و گل سے
جس راہ کو سینچا تھا کسی آبلہ پا نے

ہستی کی طرف دیکھ کے ہستی کو نہ دیکھا
مرنا بھی سکھایا مجھے جینے کی ادا نے

ہر راہ میں نقشِ کفِ پا گرم سفر ہیں
کچھ کام کیا قافلۂ بادِ صبا نے

اخلاص کو فرصت نہ ملی دیرِ بتاں سے
کعبے کو بسایا انھیں سجداتِ رِیا نے

پیچاں ہے سرِ راہ نشورؔ آج کی دُنیا
وہ گرد اُڑائی ہے زمانے کی ہوا نے

کلیاتِ نشورؔ واحدی حصّہ غزلیات

﴿۱۳۱﴾

زندگی گرمیٔ احساس پہ نازاں ہے ابھی
ذوقِ آتش ہو تو ہر شعلہ گلستاں ہے ابھی

دوش تک سلسلۂ گیسوئے پیچاں ہے ابھی
حُسنِ مضمون مہ و مہر کا عنواں ہے ابھی

آہ دل سوز ہے آنسو شرر افشاں ہے ابھی
ایک گوشہ مرے دامن کا چراغاں ہے ابھی

چشمِ ساقی میں ابھی تھوڑی سی مے باقی ہے
کوئی بہکے تو بہکنے کا بھی ساماں ہے ابھی

پھول بھی نکہتِ آوارہ کی اِک منزل ہے
آدمی اپنے خیالات کا زنداں ہے ابھی

تیرہ بختی میں بھی مرنا نہیں آساں نشورؔ
زندہ رہنا ہے کہ خود موت نگہباں ہے ابھی

﴿۱۳۲﴾

راستہ اس نے محبت کا جدا رکھا ہے
رَہ رَوِ شوق کو بھی آبلہ پا رکھا ہے

نام اِک مست نگاہی کا حیا رکھا ہے
وہ اگر دیکھیں تو میخانے میں کیا رکھا ہے

شیشۂ و جام کے اس دَورِ تحرُّ پہ نہ جا
سلسلہ گردشِ دوراں سے ملا رکھا ہے

زاہدِ خشک بھی خلّاقِ جہانِ نوَ ہے
ایک عالم کا دو عالم تو بنا رکھا ہے

کتنے آزاد ہیں دُنیا میں تری اہلِ ستم
فیصلہ جیسے قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

اشک رنگیں ہو تو پی جاؤں بہ ایمائے خلوص
بادۂ ناب ہے ساقی نے روا رکھا ہے

سازِ ہستی کا کوئی تار شکستہ نہ سمجھ
نغمہ دل گیر تھا بے صوت و صدا رکھا ہے

عشق نے کچھ نہ کیا تیرہ شَبی میں پھر بھی
اِک چراغ تہِ دامن تو جلا رکھا ہے

وقت نے کام لیا بادِ خزاں سے لیکن
ایک جھونکا ابھی صرصر کا بچا رکھا ہے

اہتمام اپنی تجلّی کا جو منظور ہوا
پردہ پہلے سے نگاہوں پہ گرا رکھا ہے

شعر محدود نہیں حُسنِ تخیُّل پہ نشورؔ
ان نگاہوں نے بھی اِک شعر چُرا رکھا ہے

﴿۱۳۳﴾

دانستہ بے خودی بھی جمالِ حیات ہے
سمجھی ہوئی ادا کو نہ سمجھیں تو بات ہے

یہ انقلابِ گردشِ لات و منات ہے
دُنیا ابھی صنم کدۂ واقعات ہے

میرے لئے بہت ہے ترا پرتوِ جمیل
تیرے لئے یہ آئینہ شش جہات ہے

بہکے ہوئے قدم سے خراماں ہے زندگی
ہستی تمام لغزشِ پائے ثبات ہے

نشتر بچھا گئی ہیں زمانے کی کروٹیں
ٹپکا ہوا سا خون رگِ کائنات ہے

تہذیبِ نوَ کی صبح کا دھوکا ہے یہ فروغ
عالم ہنوز ایک اُجالی سی رات ہے

ہر سانس میں ہے تلخئ صد شامِ غم نشورؔ
تا صبحِ مرگ فاصلۂ صد حیات ہے

۱۳۴

کام لیتے ہیں جو ایجادِ نظر سے پہلے
نورِ خورشید بناتے ہیں سحر سے پہلے

میری پلکوں سے کوئی پوچھ لے تاریخِ سرِاشک
کتنی آنکھوں میں یہ صہبا تھا، گھر سے پہلے

عشق نے جب کوئی عالم میں فسانہ لکھا
ابتدا کی تو تری زُلف و کمر سے پہلے

وعدۂ دوست کے نزدیک وہ اشکوں کا طلوع
کچھ ستارے نکل آئے تھے قمر سے پہلے

منزلِ غم سے بہت دُور لُٹا میرا جنوں
کتنے گلزار مِلے داغِ جگر سے پہلے

عقل بھی بعد میں سو ٹھوکریں کھا کر پہنچی
عشق گزرا تھا تری راہ گزر سے پہلے

توڑ ڈالے ہیں تمنّاؤں کے کچھ تار نشورؔ
کچھ تو اسباب سمیٹے ہیں سفر سے پہلے

۱۳۵

دُنیا سنور گئی ہے نظامِ دگر کے بعد
منزل پہ آ گئی ہے مشیّت سفر کے بعد

لالے میں رنگ ہے پہ کہاں یہ لہو ترنگ
دُنیا حسین ہے مرے ذوقِ نظر کے بعد

جیسے دل و نظر کے حجابات اُٹھ گئے
عالم خبر کا ہے نگہِ بے خبر کے بعد

بیتی ہوئی حیاتِ محبت کا تذکرہ
شام وسحر کی یاد ہے شام وسحر کے بعد

میں آ گیا سکوت و تبسُّم کے درمیاں
وہ مسکرا دیے سخنِ مختصر کے بعد

ہر راستہ کو لوٹ لیا اعتماد نے
رہزن بھی ایک شے ہے مگر راہبر کے بعد

تاریکیٔ حیات میں رخشاں ہے حُسنِ دوست
جلوے کہاں رہیں گے ہجومِ نظر کے بعد

حاصل ہے کائنات کا دردِ دل حیات
دُنیا میں کیا رہا مری آہِ سحر کے بعد

منزل پہ چھڑ گئی ہے کدورت کی داستاں
ہر کارواں نے گرد اُڑائی سفر کے بعد

نقشِ قدم کی آنکھ کھُلی تیری راہ میں
رستے بھی سو گئے ہیں تری رہ گذر کے بعد

اہلِ ہنر کو دیکھ رہا ہوں غمیں نشورؔ
دُنیا ہنر ہے راس بھی آئے ہنر کے بعد

۱۳۷

نظر نظر کو ساقیٔ حیات کہتے آئے ہیں
ان انکھڑیوں کو میکدہ کی رات کہتے آئے ہیں

یہ چاشنیٔ عہدِ نَو جو بات کہتے آئے ہیں
غمِ جہاں کو دِل کی کائنات کہتے آئے ہیں

فریبِ شوق کو تخیُّلات کہتے آئے ہیں
بکھر گئے تو گیسوؤں کو رات کہتے آئے ہیں

اسی کو زندگی کا ساز دے کے مطمئن ہوں میں
وہ حسن جس کو حُسن بے ثبات کہتے آئے ہیں

یہ مخلصانِ عشق بھی عجب ادا پرست ہیں
وہ مسکرا دئے تو اِلتفات کہتے آئے ہیں

حیات تا ممات ایک سلسلہ ہے عشق کا
کہاں ہیں وہ جو مرگ کو نجات کہتے آئے ہیں

نہ زاہدوں کے وعظ ترکِ عشق پر ہنسے کوئی
یہ بے خبر بھی حوصلے کی بات کہتے آئے ہیں

یہ نوجواں تو زندگی کو زندگی نہ کہہ سکے
جوانیوں میں موت کو حیات کہتے آئے ہیں

یہ ظرفِ بادہ کیا ہے بادہ آشنا سے پوچھئے
ہم اس کو شیشۂ تجلّیات کہتے آئے ہیں

غزل ہے نام حُسن کے معاملاتِ خام کا
خطا ہوئی کہ دلبروں کی بات کہتے آئے ہیں

سکون و خواب زندگی کی راہ میں کہاں نشورؔ
حیات کو مسافرت کی رات کہتے آئے ہیں

﴿۱۳۷﴾

اِک دامنِ رنگیں لہرایا، مستی سی فضا میں چھا ہی گئی
جب سیرِ چمن کو وہ نکلے پھولوں کی جبیں شرما ہی گئی

یہ صحن چمن یہ باغِ جہاں خالی تو نہ تھا نکہت سے مگر
کچھ دامنِ گل سے دور تھا میں کچھ بادِ صبا کترا ہی گئی

احساسِ الم اور پاسِ حیا، اس وقت کا آنسو صہبا ہے
اس چشمِ حسیں کو کیا کہیے جب پی نہ سکی چھلکا ہی گئی

خود بیں تھا مزاجِ حُسن مگر ، دامانِ محبت چھو ہی گیا
اندازِ تغافل کچھ بھی سہی کچھ ان کی نظر فرما ہی گئی

ہر شعلہ گرِ عہدِ ظلمت انجام سے اپنے ڈرتا ہے
جب ذکرِ سحر محفل میں چھڑا کچھ شمع کی لو تھرّا ہی گئی

اس دور میں کتنے شیخ حرم میخانے کا رستہ پوچھ گئے
ساقی کی نظر بیگانہ سہی کچھ کارِ جہاں سمجھا ہی گئی

اِک آہ جو شعلہ بار ہوئی عالم میں شرارے پھیل گئے
اِک موج جو مضطر ہو کے اُٹھی دریا کا لہو گرما ہی گئی

تہذیب کے رَعنا پیکر سے یہ بارِ امانت اُٹھ نہ سکا
ناظورۂ عہدِ حاضر کی نازک تھی کمر بل کھا ہی گئی

زہرابِ زمانہ پی پی کر جو اہلِ جنوں تھے راہ لگے
شاعر کو نشورؔ اِک زلفِ دوتا غم دے نہ سکی اُلجھا ہی گئی

مضطرب فطرتِ انساں تپشِ گام سے ہے
ورنہ منزل پہ ہر اِک قافلہ آرام سے ہے

پھیکا پھیکا سا ہے اشکوں کی زبانی غمِ دل
عشرتِ راہ طلب شکوۂ ناکام سے ہے

آستانہ جو ترا دیر و حرم سے ہے بلند
ہٹ کے سجدہ بھی مرا کچھ روشِ عام سے ہے

ڈر ہے بُجھ جائے نہ انوارِ سحر سے پہلے
وہ دِیا جس کی کہ لو تیز سرِ شام سے ہے

گریۂ شبنمِ افتادہ ہے آگاہ سحر
شمع خنداں ہے مگر بے خبر انجام سے ہے

لفظ میں کیف ہے شاعر کے تصوّر کا نشورؔ
شاعری روح فزا پرتوِ الہام سے ہے

بہار چھپ نہیں سکی گُل و سمن پُکار اُٹھے
جو حُسن جلوہ ریز ہو تو پیرہن پُکار اُٹھے

طلوعِ انقلاب کے لیے جو مضطرب تھے دل
جو رات بھی چمک اُٹھی کرن کرن پُکار اٹھے

خیال اُن کا رنگ لے تو دل دھڑک دھڑک اُٹھیں
وہ انجمن فروز ہوں تو انجمن پُکار اُٹھے

کہا یہ کس نے حُسن سے کہ پھر سُبک خرام ہو
بہ ایں ادائے سادگی کہ بانکپن پُکار اُٹھے

یہ بجلیوں کا تھا کرم گل و بہار و باغ پر
کہ آشیاں پرست بھی چمن چمن پُکار اُٹھے

الم کوئی گنہ نہیں کہ مدّتوں رہے چھپا
جبینِ غم پہ بَل پڑے تو ہر شکن پُکار اُٹھے

کچھ اس طرح کی گرد اُٹھی کہ راہِ عمر کھو گئی
لُٹا کچھ ایسا کارواں کہ راہزن پُکار اُٹھے

یہ میکدوں میں ان دنوں کمی ہے لعلِ ناب کی
نئی اَدا کے بادہ کش مےَ کہن پُکار اُٹھے

وجود چھن گیا مگر حیات چُپ نہیں رہی
گزر کے بھی شہیدِ غم پسِ کفن پُکار اُٹھے

فضائے نظم تازہ ہے نشورؔ ان دنوں مگر
چُھٹا جو دامنِ غزل تو اہلِ فن پُکار اُٹھے

﴿۱۴۰﴾

جانبازوں کے لب پر بھی اب عیش کا نام آیا
جس ہاتھ میں تیشہ تھا اس ہاتھ میں جام آیا

اِک تازہ تغیرّ ہے تہذیب کی دُنیا میں
یا حُسنِ حقیقی کو اندازِ خرام آیا

راحت کا تصوّر ہی باقی نہ رہا شاید
ہونٹوں پہ تکلّف سے آرام کا نام آیا

کچھ سوچ کے اِک راہِ پُر خار سے گزرا تھا
کانٹے بھی نہ راس آئے دامن بھی نہ کام آیا

ساقی یہ حریفوں کو پہچان کے دینا کیا
جب بزم سے ہم نکلے تب دَور میں جام آیا

اس تیرہ نصیبی میں کرنوں کا سہارا کیا
سورج کی طرف دیکھا وہ بھی لبِ بام آیا

یہ راز و نیازِ غم کچھ وہ بھی سمجھتے ہیں
جب چوٹ پڑی دل پر پلکوں کو سلام آیا

غم اور خوشی دونوں ہر روز کے مہمان ہیں
یہ صبح بہ صبح آئی وہ شام بہ شام آیا

چھنکے ہوئے شیشوں سے دل کتنے بنائے ہیں
جب جام کوئی ٹوٹا دیوانوں کے کام آیا

کانوں میں کچھ آتی ہے آواز پھڑکنے کی
پھر کوئی نیا طائر شاید تہِ دام آیا

اشعار نشورؔ اکثر اُن کی بھی زباں پر ہیں
چُپ رہ نہ سکا کوئی جب وقتِ کلام آیا

۱۴۱

غزل مسلسل

فطرت[1] ہے حجابات سے تھک جائے تو کیا ہو
بجلی ہے مقابل میں چمک جائے تو کیا ہو

ٹکرائے حجابوں سے نسیم سحری اور
شاخِ گلِ رنگیں سی لچک جائے تو کیا ہو

نزدیک ہی منزل گہِ جاناں ہے مگر عشق
نادیدہ مسافر ہے بھٹک جائے تو کیا ہو

گو نکہتِ داماں کو نہیں اِذنِ تجاوز
آغوشِ تمنّا ہی مہک جائے تو کیا ہو

[1] ایک حُسن پردہ نشیں کے متعلق

جس وقت نگاہوں میں کلی پھول رہی ہو
کانٹا سا کوئی دل میں کھٹک جائے تو کیا ہو

دامن بھی ہے مشتاق کسی ہاتھ کا لیکن
ذوقِ پسِ پردہ ہے جھجک جائے تو کیا ہو

معشوق ہے آئینہ طلب کر لے تو کیا دُور
دوشیزہ ہے انداز بہک جائے تو کیا ہو

ایسے میں کہ درکار ہوں خاموش زبانیں
پیمانۂ گفتار چھلک جائے تو کیا ہو

کلیوں کے تبسُّم پہ تھرکتی ہیں ہوائیں
شاعر ہے اشاروں میں بہک جائے تو کیا ہو

مدّت پہ نشورؔ آج ہے جاگا ہوا سا کچھ
پھر خوابِ حسیں کوئی تھپک جائے تو کیا ہو

﴿۱۴۲﴾

ہزار شمع فروزاں ہو روشنی کے لیے
نظر نہیں تو اندھیرا ہے آدمی کے لیے

چمن چمن ہے محبت جہاں جہاں ہے جمال
یہ اہتمام ہے اک دل کی زندگی کے لیے

نگاہِ دوست سلامت کہ فیضِ گریہ سے
بہت گہر ہیں مرے دامنِ تہی کے لیے

شبِ نشاط مبارک تجھے یہ ماہ و نجوم
سحر بہت ہے مری کم ستارگی کے لیے

نئی بہار گلستاں میں ٹھیرتی ہے ضرور
فریبِ عمرِ تبسُّم ہے ہر کلی کے لیے

نگاہِ مست کی صہبا ٹپک رہی ہے نشورؔ
غزل کہی ہے طبیعت کی سرخوشی کے لیے

﴿۱۴۳﴾

نہیں حُسن اب شمعِ فانوس خانہ
یہ گیسو بکھرتے ہیں شانہ بہ شانہ

اُمنڈتے ہیں آنسو جو چھیڑو فسانہ
یہ آنکھیں بھی کچھ ڈھونڈھتی ہیں بہانہ

بہت کم تھی عمرِ نگاہ و تبسُّم
سحر تک نہ تھا التفاتِ شبانہ

مرے آنسوؤں کی ادا کون سمجھے
گلوں کا تبسُّم نہ سمجھا زمانہ

ابھی اور بجلی ہے درکارِ گلشن
ابھی سرد ہے شعلۂ آشیانہ

کسی شام نے اُن کے گیسو جو کھولے
میں بھولا نسیمِ سحر کا فسانہ

نشورؔ اب غزل ہے حیاتِ دو عالم
یہ عنوانِ زُلف و کمر اِک بہانہ

﴿۱۴۴﴾

مری رات کا اِک سکوں تاب عالم
پریشان ہے ان کے پسِ دوش گویا

وہ نظریں ہیں صبر آزمائے تمنّا
وہ جلوہ ہے غارت گرِ ہوش گویا

ابھی غم فزا کروٹوں میں ہے باقی
گداز شبستانِ آغوش گویا

دِلوں کی پرکھ ہے یہ حُسنِ تغافل
وہ طرزِ ملاقات کم جوش گویا

لرزتی ہوئی موجِ مَے ہے وہ دامن
گریزاں ہے اندازِ مَے نوش گویا

کلی مُسکرائی لبِ نیم وا پر
فضا ہوگئی نیم خاموش گویا

نشورؔ اب مری غفلتیں آگہی ہیں
زمانہ ہے صد ساغرِ ہوش گویا

تخیُّل رقص کرتا ہے تجلّی چھائی ہوتی ہے
میں شاعر ہوں بہت رنگیں مری تنہائی ہوتی ہے

وہی[۱] بھولی ہوئی سی یاد ان کی آئی ہوتی ہے
مرے کاندھوں پہ جس دم زلفِ شب لہرائی ہوتی ہے

گزر جاتا ہوں مرگ و زیست کی فرسودہ راہوں سے
ٹھہرتا ہوں جہاں وہ منزلِ رعنائی ہوتی ہے

یہ دل بھی کچھ عجب دیوانہ رَو ہے ابتدا ہی سے
وہیں جاتا ہے جس رستہ پہ ٹھوکر کھائی ہوتی ہے

نشورؔ اس عہد میں دوشِ خزاں پر ہیں بہاریں بھی
کہ اس محفل میں پھولوں کی ہنسی مُرجھائی ہوتی ہے

---

[۱] مجموعۂ کلام سوادِ منزل میں شعر اس طرح ہے
کوئی بھولی ہوئی سی یاد اس دم آئی ہوتی ہے
مرے کاندھے پہ جس دَم زلف شب لہرائی ہوتی ہے

ٹھکرائے ہوئے دل کی یاد آئی تو کیا آئی
پھینکا ہوا شیشہ تھا ٹوٹا تو صدا آئی

عشرت گہِ باطل کی رونق میں کمی کیا ہے
گر بادِ صبا جاکر اِک شمع بجھا آئی

دن ذوقِ نوازش سے بیگانہ سہی لیکن
جلوہ ہے نہ شعلہ ہے رات آئی تو کیا آئی

شب کو گل و لالہ بھی کروٹ سی بدلتے ہیں
وہ سُوئے تو ان کو بھی اِک یاد جگا آئی

بڑھتی ہوئی بیتابی کچھ روٹھ گئی شاید
جھٹکے ہوئے دامن سے ہاتھوں کو حیا آئی

خورشید اگر ڈوبے دریا میں تو کیا حاصل
شبنم سے سحر تیری جب پیاس بُجھا آئی

اُٹھتا ہے قدم لیکن رفتار غنودہ ہے
نیند آ گئی رستوں کو منزل کی ہوا آئی

ہے کچھ تو نشورؔ احساس اس عمرِ رواں کا بھی
اِک روز کنارے پر کشتی تو لگا آئی

﴿۱۴۷﴾

سمجھو تو یہ بھی تنگی چشمِ بہار ہے
شبنم کو زندگی کی کرن ناگوار ہے

ساقی تو اس نگاہ سے دل کی طرف نہ دیکھ
یوں ہی شکستہ شیشۂ لیل و نہار ہے

جوشِ عوام سے ہیں پریشاں سکوں پسند
موجوں کا اضطراب بھی ساحل پہ بار ہے

پیچھے نہ رہ گیا ہو کہیں میرِ کارواں
جو قافلہ کے ساتھ اُڑا وہ غبار ہے

یہ آدمی جو خاک کی پستی سے ہے اُٹھا
انسان ہوگیا تو دو عالم شکار ہے

اس دور میں کہیں بھی ٹھکانا نہیں نشورؔ
شاعر وطن میں رہ کے غریبُ الدیار ہے

﴿۱۴۸﴾

شاید کہ نظر پہنچے تیری غمِ انساں تک
اے صبحِ چمن پرور چل شامِ غریباں تک

اِک طرزِ تغافل سے تھی دلکشیٔ عنواں
افسانہ بھی رنگیں ہے اشکِ پسِ مژگاں تک

مٹی سے کرن تک ہے اِک عشق کی تابانی
کس حُسن کا جادو ہے شبنم سے شبستاں تک

ٹوٹی ہوئی کشتی کا اس دور میں کیا شکوہ
ساحل پہ یہ رونق ہے اندازۂ طوفاں تک

ویرانیٔ رنگیں ہے یا رنگ پہ ویرانہ
بس ایک حکایت ہے گلشن سے بیاباں تک

کیوں دامنِ احساں کا گھبرا کے سہارا لوں
جب ہاتھ پہنچتا ہے ظالم کے گریباں تک

ان مست نگاہوں کے فتنے کا یقیں کرلو
یا ساتھ چلو میرے اس آئینہ ساماں تک

ہندی بھی نشورؔ آخر اُردو کے پجاری ہیں
بُت خانہ کے باسی ہیں کعبہ کے نگہباں تک

۱۴۹

نگاہِ مست سے اخذِ غمِ حیات کرے
خبر نہ ہو تو کسی بے خبر سے بات کرے

کہاں فلک کے شرارے کہاں زمیں کے نجوم
وہ کچھ دنوں ابھی مشقِ تجلّیات کرے

کچھ اس نگاہ سے بچ کر گزر رہی ہے حیات
نظر ملے تو ہر اِک شے کو بے ثبات کرے

حریف عمر گریزاں ہے وہ گدائے شراب
جو بند شیشے میں اِک لمحۂ حیات کرے

یہ اِک جہان تو اب تک سنبھل سکا ہی نہیں
کسے پڑی ہے کہ پھر کُن سے کائنات کرے

نہ ہو اُمید تو یہ تیرگیِ بزمِ حیات
جہاں سے دن ہے نکلتا وہیں سے رات کرے

نگاہِ حُسن ہے محجوبِ التفات مگر
کبھی کبھی تو کسی اجنبی سے بات کرے

جب اِک ادائے تغافل پہ خوش ہیں اہلِ جنوں
انھیں بھی کیوں کوئی پابندِ التفات کرے

مری شراب سے چیں بر جبیں نہ ہو واعظ
خدا تجھے بھی کبھی رند خوش صفات کرے

نہیں ہے شاعرِ فطرت پہ کوئی قید نشورؔ
مگر کبھی تو نظر سُوئے واقعات کرے

۱۵۰

ہر ذرّۂ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا

تھا حُسن مگر اِک نگہِ نیم رضا سے
گیسو بہ کمر، لالہ شکن ہم نے بنایا

صد شکر کہ ہے ان کا تبسُّم بھی ہمیں پر
کلیوں میں جنھیں غنچہ دہن ہم نے بنایا

حصّہ ہے یہاں شاخ پہ آہو کی ابھی تک
اور صحنِ غزالانِ چمن ہم نے بنایا

اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی
اپنے لیے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

ہر جذبۂ آزادیِ فطرت کو ہوا دی
ہر بادۂ پیمانہ شکن ہم نے بنایا

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اِک سلسلۂ دَار و رَسن ہم نے بنایا

ڈرتے ہیں خموشی سے ہماری مہ و انجم
چُپ رہ کے وہ اندازِ سخن ہم نے بنایا

ٹکرائے کبھی موج سے ساحل پہ کبھی ہیں
بہتے ہوئے دریا میں وطن ہم نے بنایا

اشکوں سے ہمارے ہے منوّر نئی دُنیا
شبنم کو ضیا دی تو کرن ہم نے بنایا

مستقبلِ تہذیب کا نغمہ وہی ٹھہرا
جو زمزمۂ گنگ و جمن ہم نے بنایا

آفاق کا ہر جلوہ نشورؔ اُس میں عیاں ہے
مِل جُل کے وہ آئینۂ فن ہم نے بنایا

﴿۱۵۱﴾

خاکِ تاباں

زمانہ دلکش بنا رہا ہوں فضا درخشاں بنا رہا ہوں
سحر کی آہوں قمر کے جلووں سے نظمِ دوراں بنا رہا ہوں

نوا کی تلخی مٹا رہا ہوں غمِ خوش الحاں بنا رہا ہوں
جو دشتِ غربت کی داستاں میں گلوں کو عنواں بنا رہا ہوں

حسیں شراروں بلند تاروں سے خاکِ تاباں بنا رہا ہوں
ٹھہرا بھی انقلابِ عالم کہ تیرا انساں بنا رہا ہوں

نظامِ ہستی کی ابتری میں ترا غمِ کامیاب مشکل
تری تمنّا کا نام لے کر حیاتِ انساں بنا رہا ہوں

نظر میں گلکاری تبسُّم تو دل میں رنگینیٔ تمنّا
جہاں سے جلوے گزر رہے ہیں وہاں گلستاں بنا رہا ہوں

حیاتِ انساں کو دے رہا ہوں زبان رنگیں شعورِ غمگیں
وہ صبح خنداں بنا چکے ہیں میں شمعِ سوزاں بنا رہا ہوں

سکھا رہا ہوں بپھرتی موجوں کو بڑھ کر تھمنا سنبھل کے چلنا
جو اپنی کشتی کا ناخدا ہو وہ ذوقِ طوفاں بنا رہا ہوں

سنو گے انجام آشیاں بھی جو یوں شراروں سے کھیلتا ہوں
چھپا چھپا کر غمِ محبت چراغ داماں بنا رہا ہوں

میں کارِ تعمیر لے رہا ہوں نشورؔ تخئیل رنگ و بو سے
بنانے والا ہوں میں جو دُنیا اسے بہاراں بنا رہا ہوں

غزلیں

(کچھ اور رنگ کی)

﴿۱۵۲﴾

وفا کے بعد بھی تو مائل جفا کیوں ہے
ترے وصال سے مشکل تری رضا کیوں ہے

زمانہ دیکھ کے بیمار ہوگیا جس کو
وہی مرے دلِ بیمار کی دوا کیوں ہے

وفا سکھائی ہے جب آپ نے زمانے کو
تو نام آپ کا پھر حُسنِ بے وفا کیوں ہے

تری ”سبیل“ میں کچھ بھی نہیں تو ناجائز
مری شراب میں کچھ ہے تو ناروا کیوں ہے

خرامِ باد بہاری سے کِھل گیا صحرا
چمن میں قحط نسیمِ بہار کا کیوں ہو

فضائے روح میں رکھتے ہوئے جمالِ ابد
نشورؔ شیفتۂ حُسنِ کم بقا کیوں ہے

نشورؔ صاحب نے ”صہبائے ہند“ بار اوّل میں شامل ۸ اشعار میں سے صرف ۶ شعر لیے ہیں۔

﴿۱۵۳﴾

مجھے کہاں ابھی فرصت نگاہ اُٹھانے کی
قسم ہے حُسنِ تخیُّل میں ڈوب جانے کی

سحر کا لطف بھی جاتا ہے جلد لا ساقی
فضا تو دیکھ ستاروں کے جھلملانے کی

بنا لیا ہے فرشتوں نے آپ کے کعبہ
مگر زمیں تھی وہ میرے شراب خانے کی

زمانہ جس کو سمجھتا ہے آج شورِ نشورؔ
وہ ابتدا ہے محبت کے اِک فسانے کی

﴿۱۵۴﴾

رہبر جو تیری نرگسِ مَے نوش ہوگئی
اصلاحِ قوم دِل سے فراموش ہوگئی

پھر زُلف زینتِ کمر و دوش ہوگئی
پھر چشمِ آرزو سے ہم آغوش ہوگئی

بیمارِ ہجر شام ہوئی اور تڑپ گیا
رگ رگ کسی خیال سے پُر جوش ہوگئی

دریائے غم میں ڈوب کے پیتا ہوں میں نشورؔ
فطرت مری کہاں کی بلا نوش ہوگئی

عروجِ ماہ میں جب وقتِ شام ہوتا ہے
خیال آپ کا محشر خرام ہوتا ہے

شرابِ حسن سے مستی ٹپکنے لگتی ہے
عجیب رنگ ترا صبح و شام ہوتا ہے

نگاہ چار ہوئی اور جُھک گئیں نظریں
شباب مانعِ طرزِ سلام ہوتا ہے

کسی کی یاد مصیبت کی یاد ہوتی ہے
کسی کا نام قیامت کا نام ہوتا ہے

ہر ایک شعر پہ گویا پھڑک اُٹھی محفِل
نشورؔ آپ کا بھی کیا کلام ہوتا ہے

''مہ ساون'' میں جوں جوں رودِ گنگا بڑھتی جاتی ہے
تمنّا آپ کی جانِ تمنّا بڑھتی جاتی ہے

گھٹاؤں میں بہارِ آرزو جب تم نہیں ہوتے
بلائے غم بہ گلبانگِ پپیہا بڑھتی جاتی ہے

وہ ہریالی وہ صحرا وہ فروغِ جلوۂ گلشن
بہارِ سبز میں برقِ تجلّی بڑھتی جاتی ہے

ہوا برسات کی صحرا بہ صحرا ہوتی آتی ہے
گھٹا سیلاب کی دریا بہ دریا بڑھتی جاتی ہے

چڑھے ساون وہ اللہ رے کسی کا حسنِ روز افزوں
ہر اِک چھینٹے پہ آبِ روئے زیبا بڑھتی جاتی ہے

وہ جھولے پر کوئی نظّارۂ جنباں معاذ اللہ
تڑپ جاتا ہے دل چشمِ تماشا بڑھتی جاتی ہے

اُدھر تھمتا نہیں پانی، اِدھر رُکتے نہیں مضموں
نشورِؔ واحدی کی طبع والا بڑھتی جاتی ہے

﴿۱۵۷﴾

رفو کا تذکرہ اے فطرتِ چالاک رہنے دے
میں اِک دیوانہ ہوں مجھ کو گریباں چاک رہنے دے

شکایتہائے رنگیں، نالہ ہائے زار سُنتا جا
کسی حد تک اسیرِ زُلف کو بیباک رہنے دے

نظر آتی ہیں کچھ کچھ خامیاں ربطِ محبت میں
ابھی کچھ دن خیالِ گیسوئے پیچاک رہنے دے

نہ اس کو لالۂ و گل کر نہ اس کو صورتِ انساں
مری اس ایک مُٹھی خاک کو بس خاک رہنے دے

بچھا دے جانمازِ زہد لے جاکر تہِ طوبےٰ
مرا پشمینۂ دیرینہ زیرِ تاک رہنے دے

نشورؔ آخر مٹانے پر مرے تو کیوں ہے آمادہ
مرا نام و نشاں ظالم تہِ افلاک رہنے دے

آیا جو حشر شورشِ امکاں لیے ہوئے
اُٹھا مَیں اُن کا ہاتھ میں داماں لیے ہوئے

اُس کا نیازمند ہوں جس کی نظر نظر
ہے اِک فریبِ جنبشِ مژگاں لیے ہوئے

نکلا پھر آفتاب پھر آئی مری سحر
شامِ فراق، شامِ غریباں لیے ہوئے

اوراقِ کائنات میں اب میں کہاں نشوؔر
افسانہ مٹ گیا مرا عنواں لیے ہوئے

نگاہِ اوّلیں کا آج تک جب نام آتا ہے
وہی رعنائیاں لے کر خیالِ خام آتا ہے

میں ان جلوؤں میں دستِ شوق و ساغر بھول جاتا ہوں
کوئی رنگیں ادا لے کر جو رنگیں جام آتا ہے

مسلسل شامِ غربت، شامِ فرقت، شام بیماری
مرا دل کانپ جاتا ہے جو لفظِ شام آتا ہے

فریبِ حُسن کو بھی یاد رکھ اے تشنۂ عقبیٰ
تماشا آج کا دیکھا ہوا کل کام آتا ہے

نشوؔر ان کے غرورِ حسن کا دامن پکڑ لوں میں
مگر میری کمندِ شوق پر الزام آتا ہے

کبھی سنتے ہیں عقل و ہوش کی اور کم بھی پیتے ہیں
کبھی ساقی کی نظریں دیکھ کر پیہم بھی پیتے ہیں

خزاں کی فصل ہو روزے کے ایامِ مبارک ہوں
طبیعت لہر پر آئی تو بے موسم بھی پیتے ہیں

کہاں تم دوستوں کے سامنے بھی پی نہیں سکتے
کہاں ہم روبروئے ناصحِ برہم بھی پیتے ہیں

طوافِ کعبہ بے کیفیّتِ مے ہو نہیں سکتا
ملا لیتے ہیں تھوڑی سی اگر زمزم بھی پیتے ہیں

کہاں کی توبہ، کیسا اتّقا عہدِ جوانی میں
اگر سمجھو تو آؤ، تم بھی چکھّو، ہم بھی پیتے ہیں

نشورؔ آلودۂ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے
یہ باتیں راز کی ہیں قبلۂ عالم بھی پیتے ہیں

دیا ساقی نے اوّل روز وہ پیمانہ مستی میں
کہ میں نا آشنا پیکر ہوا دیوانہ مستی میں

مری پوجا تھی کیف انگیز نظروں کی پرستاری
مرا سجدہ تھا پیشِ ابروئے جانانہ مستی میں

شرابِ آتشیں وہ ہے کہ دو اِک گھونٹ پیتے ہی
جو ساقی ہو تو آتا ہے نظر پیمانہ مستی میں

کوئی کہتا ہے مسجد ہے کوئی کہتا ہے باہر جا
الٰہی کیا میں بھُولا ہوں رہِ میخانہ مستی میں

نظر آتا ہے مجھ کو بوریا بھی تختِ طاؤسی
گدا رکھتا ہے گویا سطوتِ شاہانہ مستی میں

نشہ تھا مجھ کو اور یاروں نے چاہا چھین لیں بُوتل
مگر کام آ گئی کچھ جرأتِ رندانہ مستی میں

خبر کیا تھی کہ واعظ ہے، یہی سمجھا کہ ساقی ہے
اُٹھا اور اُٹھ کے جا لِپٹا میں بے تابانہ مستی میں

قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا کہیں جا کر
نشورؔ اس وقت ہوں کچھ ہوش سے بیگانہ مستی میں

۱۶۲

یہاں سجدہ وہاں سجدہ معاذ اللہ دیوانہ
نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بت خانہ

تری آنکھیں جمالِ یار پر ٹھہریں تو کیا ٹھہریں
نظر اِک رشتۂ شبنم تجلّی آفتابانہ

معاذ اللہ میخانے کے اورادِ سحر گاہی
اذاں میں کہہ گیا میں ایک دن یا پیر میخانہ

کچھ اس سادگی سے وہ تشریف لائے
کوئی جیسے اپنی ادا بھول جائے

چمن تک تبسّم ہے اس دورِ غم کا
خوشی ہو تو سارا جہاں مُسکرائے

سرکتا ہوا راستہ ہے یہ دُنیا
جو سُو جائے کوئی تو منزل جگائے

اندھیروں کے پیچھے قدم رکھنے والو
ٹھہر جاؤ پہلی کرن پھوٹ جائے

بہاریں ہیں جب گوشہ گیر بیاباں
صبا سے بھی کہہ دو کہیں خاک اُڑائے

نشورؔ اب سخن بھی ہے فریاد نغمہ
کسے اتنی فرصت غزل گنگنائے

میں بُھول گیا تجھ میں محرابِ خدا خانہ
اے سجدہ گہِ عالم، اے ابروئے جانانہ

وہ جلوۂ مستانہ ، وہ زلفِ پسِ شانہ
برباد کُنِ کعبہ، غارت گرِ بت خانہ

وہ چہرۂ رنگیں ہے، نظارہ بہ نظارہ
وہ زلفِ مسلسل ہے افسانہ در افسانہ

تائیدِ جنوں میں ہیں کچھ عقل کے مارے بھی
اس ہوش کی دُنیا میں تنہا نہیں دیوانہ

ہر جزو حکایت کا حاصل بھی ہے باطل بھی
چونکے تو حقیقت ہے نیند آئی تو افسانہ

دیوانہ محبت میں معذورِ محبت ہے
کچھ آپ سے بیگانہ کچھ حُسن سے بیگانہ

پہنچا دیا ساقی نے پایانِ حقیقت تک
پیمانہ بہ پیمانہ، میخانہ بہ میخانہ

ہر گوشہ مُنوّر ہے دُنیا کا بہ فیضِ غم
جلتا ہے چراغ اپنا کاشانہ بہ کاشانہ

اِک وجد ٹپکتا ہے ہر لفظ محبت سے
ہے شعرِ نشورؔ آخر کس حُسن کا افسانہ

﴿١٦٥﴾

وہ نگاہِ ناز بھی اپنا کام کر گئی
شبنمِ حیات پر سو کرن کتر گئی

ہر تبسّم حسین شورِ کائنات ہے
اِک کلی جہاں کِھلی دُور تک خبر گئی

بے اثر نہیں رہیں میری غم طرازیاں
سادہ سادہ وہ نظر داستاں سے بھر گئی

شمعِ کہنہ سے تری بزمِ نو ہے ضوفشاں
سو چراغ جل اُٹھے لَو جدھر جدھر گئی

گردِ راہ راہ میں لطف رہروی بھی تھا
منزلوں نے آلیا رونقِ سفر گئی

مخلصانِ بے خبر دور مہر و ماہ میں
شمع ڈھونڈتے رہے روشنی گزر گئی

کتنے جام توڑ کر میکدہ ہیں بے خطا
مے اگر چھلک گئی مے کشوں کے سر گئی

ہے چمن کی آبرو قافلہ بہار کا
بوئے گل کا ساتھ کیا بے وفا جدھر گئی

از وجود تا عدم ایک غم کی رات تھی
کچھ یہاں گزر گئی کچھ وہاں گزر گئی

وہ گزر رہے ہیں آج شامِ انتظار سے
یا چمن سے تا چمن چاندنی بکھر گئی

﴿۱۶۶﴾

دلّی کی زبان

اُردو کو یوں ہی سحرِ رواں کہتے رہیں گے
دلّی ہے تو دلّی کی زباں کہتے رہیں گے

ترتیبِ خیالات کو شاعر کی زباں میں
گُلدستۂ نازک کمراں کہتے رہیں گے

بے سود ہے ہر آہِ رسا بزمِ طرب میں
گوشِ گلِ رنگیں کو گراں کہتے رہیں گے

پہچان گیا اہلِ سیاست کی زباں بھی
یہ آگ لگی ہو تو دُھواں کہتے رہیں گے

اس دَور میں جو لوگ ہیں نبّاضِ گلستاں
پھولوں کو بھی شبنم کی دکاں کہتے رہیں گے

۱۶۷

اِک روشنی سی گرد میں شامل قریب ہے
منزل نہیں تو جلوۂ منزل قریب ہے

یہ موت ہے کہ زیست تمنّا ہے یا فریب
رُکتا ہے کیوں قدم کوئی منزل قریب ہے

دُنیا کو میں نے تیرے ہی غم سے سمجھ لیا
محفل سے شمع، شمع سے محفل قریب ہے

نشتر کھٹک رہا ہے رگِ جاں کے آس پاس
بس اے نگاہِ ناز ادھر دل قریب ہے

مدّھم سے پڑ گئے ہیں تلاطم کے زمزمے
طوفاں یہ کہہ رہا ہے کہ ساحل قریب ہے

میں دیکھتا ہوں وقت کی نازک کلائیاں
خنجر اُٹھا سکیں گے نہ قاتل قریب ہے

آسانیاں ہیں عقدۂ دشوار کی خبر
مشکل نہ ہو تو جان لو مشکل قریب ہے

انسانیت ہے فطرتِ آزاد کا پتہ
حق دُور ہے یہاں سے نہ باطل قریب ہے

واعظ نے دَورِ جام پہ تنقید چھوڑ دی
وہ بھی ہو اس ثواب میں داخل قریب ہے

اِک سلسلہ روایتِ نوَ کا بھی ہے نشورؔ
غالب سے رنگِ رفتۂ بے دل قریب ہے

﴿۱۶۸﴾

میکدہ کی جانب چل زندگی ہے مستی ہے
نقدِ عاقلی دے کر مَے ملے تو سستی ہے

ہیں زمیں کے ذرّے بھی سیر ماہ و انجم میں
کس قدر بلندی پر آج کل کی پستی ہے

کارواں کے دیوانے اس جگہ نہ منزل کر
شہر کم چراغاں ہے رہبروں کی بستی ہے

دربدر حرم والے سجدہ ریز ملتے ہیں
بُت نہیں رہے لیکن ذوقِ بُت پرستی ہے

میری کشت ویراں تک ابر ہے تو آئے گا
میں گھٹا سے کیوں پوچھوں تو کہاں برستی ہے

طور کچھ نہیں لیکن مُنکرِ تجلّی سُن
عشق ہے تو مستی ہے، حُسن ہے تو ہستی ہے

مانع نوازش ہے اِک حسیں تکلُّف سا
کچھ حیا طرازی ہے کچھ حنا برستی ہے

کاٹتی ہے تنہائی آرزو کے لمحوں میں
ناگ جیسے پالے ہیں رات جیسے ڈستی ہے

لُٹ رہے ہیں بے منّت اب نشورؔ گنجینے
زندگی جو مہنگی ہے شاعری بھی سَستی ہے

﴿۱۶۹﴾

آنسو مری پلکوں پہ شتاباں نہیں ملتا
اس کوچہ میں ہر وقت چراغاں نہیں ملتا

نزدیک وہ آئے تو ہمیں ہوش سے گزرے
ہاتھ آیا جو دامن تو گریباں نہیں ملتا

کی خونِ جگر سے بھی زمانے کی تواضع
پھر بھی تو مزاجِ غمِ دوراں نہیں ملتا

ساحِل پہ جو تھا میرے قدم لیتی تھیں موجیں
اب ڈوبنے آیا ہوں تو طوفاں نہیں ملتا

اِک میں ہوں نظر آتا ہوں آرائش محشر
اب کوئی گناہوں پہ پشیماں نہیں ملتا

ویرانوں میں مرجھا گئے ہیں کتنے شگوفے
ہر پھول کو آغوشِ گلستاں نہیں ملتا

لہجے سے نشورؔ اپنے عیاں ہے غم ہستی
اب شاعرِ فطرت بھی غزل خواں نہیں ملتا

﴿۱۷۰﴾

پھولوں پہ کر نگاہ کہ خونِ جگر ملے
کوشش نہ کر کہ جانِ چمن سے نظر ملے

پروردۂ ہزار قیامت ہے حُسنِ دوست
فتنے بہت اُٹھے ہیں تو کچھ فتنہ گر ملے

اہلِ کمال کا ہے پتہ تیرگیِ غم
ڈھونڈو وہیں چراغ اندھیرا جو گھر ملے

ہر راہ میں ہے گنجِ شہیدانِ انقلاب
وہ وقت ہے کہ سنگ اُٹھاؤ تو سر ملے

برقِ گریز پا کا تبسّم ہے یہ حیات
شکوہ نہ کر اگر نگہِ مختصر ملے

نصف النہار شوق پہ ہے آفتابِ زیست
پردہ جو شام کا بھی اُٹھے دوپہر ملے

غم خانے سے نکل کے جو میں نے نگاہ کی
جو باخبر ملے تھے وہی بے خبر ملے

یوں ہوگیا ہے راہ میں عصرِ رواں کا ساتھ
جیسے کوئی حسین کہیں ہم سفر ملے

بے جدّتِ نظر ہے تخیّل بھی شرمسار
وہ کام کر کہ فکرِ سخن تازہ تر ملے

سازِ دل حیات ہے مصروفیت نشورؔ
بشکستہ کوئی تار ہے فرصت اگر ملے

چاند تاروں کی یہ دُنیا جو نظر آئی ہے
دُور تک ساتھ مرے گردِ سفر آئی ہے

محفلِ حُسن ہے آشفتہ مزاجوں کا مقام
نکہتِ گل جو پریشاں تھی ادھر آئی ہے

میرے سینے میں لہو کی یہ لرزتی ہوئی بوند
دل نہیں دل کے دھڑکنے کی خبر آئی ہے

خارزاروں میں کہاں تازہ بہاروں کا گزر
راستہ بھول کے کچھ بادِ سحر آئی ہے

ایک ٹوٹے ہوئے دل میں یہ سمائی ہوئی یاد
آئینہ توڑ کے تصویر اُتر آئی ہے

زندگانی کی تڑپ آج کہاں ملتی نشورؔ
شاعروں سے روشِ خونِ جگر آئی ہے

مرا دل نہ تھا الم آشنا کہ تری ادا پہ نظر پڑی
وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بنائے خونِ جگر پڑی

مری زندگی تھی کہ منزلِ تب و تابِ غم میں اُتر پڑی
نہ جنوں کی راہ گزر ملی ، نہ خرد کی راہ گزر پڑی

جسے چاہے مالکِ رنگ و بو اسی بے رُخی میں نواز دے
میں اِدھر تھا مُنتظرِ کرم وہ نگاہِ ناز اُدھر پڑی

ترا کام سیرِ مُدام ہے نہ کہ گلستانوں میں ٹھہرنا
یہ کلی کلی کے فریب میں تو کہاں سے بادِ سحر پڑی

کوئی موجِ بحر سے دور ہے تو جبینِ بحر پہ کیا شکن
تری رحمتوں کو ہوا یہ کیا، مری لغزشوں پہ نظر پڑی

وہ بہار آنے کا شور اُٹھا کہ نظام ہوش بھی کُھو گیا
نہ چمن رہا نہ وہ آشیاں جو نگاہ بارِ دگر پڑی

تجھے کیا ہو قدر ملال کی، تو ہے نارسیدۂ زندگی
جو بہت پھرے ہیں گلی گلی تو جبیں پہ گردِ سفر پڑی

جو حدودِ صبح میں رُک گیا اسے اتفاقِ سفر کہو
میں وہی مسافر شام ہوں مرے راستہ میں سحر پڑی

بہ نگاہِ ساقی مہر و مہ کبھی خالی جام نہیں رہا
میں زمین پہ ڈھونڈ رہا تھا کچھ کہ وہ کہکشاں سے اُتر پڑی

سر راہ اُن کو بیک نظر کبھی دیکھئے تو وہی اَدا
وہی بے نیازیِ مَہوَشاں وہی زُلف تا بہ کمر پڑی

جو دُرودِ اہلِ سخن ہوا تو ہجومِ شامِ اَودھ بڑھا
وہ غزل نشورؔ کی ہوگئی، نئی محفلوں میں خبر پڑی

مجموعۂ کلام

سوادِ منزل

نئی

مشہُور

غزلیں

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک

نوٹ: ۱۹۶۲ء میں نشورؔ واحدی صاحب نے یہ مسودہ سنگم کتاب گھر اُردو بازار دہلی کو برائے اشاعت بھیجا تھا۔ یہ شعری مجموعہ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس درمیان نشورؔ صاحب نے جو غزلیں کہیں وہ اس مجموعہ میں ''نئی مشہور غزلیں'' کے نام سے شامل ہیں۔ سوادِ منزل کی منتخب غزلیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ سوادِ منزل کی منتخب غزلیں اس میں شامل نہیں کیونکہ اس کتاب میں شامل دو سے زیادہ مجموعوں میں موجود ہیں۔ مرتّب

۱۷۳

میں ابھی سے کس طرح ان کو بے وفا کہوں
منزلوں کی بات، راستے میں کیا کہوں

حُسنِ بے حجاب پر کوئی پردہ ڈال لو
تم اُسے صنم کہو، میں اُسے خُدا کہوں

اے حریصِ میکدہ خونِ زندگی نہ پی
تو شراب اگر پیئے، تجھ کو پارسا کہوں

گیسوئے سیاہ کی یہ حَسیں دَرازیاں
رات کیوں کہوں انھیں رات کی دُعا کہوں

ترجمانِ راز ہوں یہ بھی کام ہے مِرا
اُس لبِ خموش نے مجھ سے جو کہا، کہوں

غیر میرا حالِ غم پوچھتے رہے مگر
دوستوں کی بات ہے دُشمنوں سے کیا کہوں

امتحانِ شوق ہے ایسی عاشقی نشورؔ
دل کا کوئی حال ہو اُن کو دِلرُبا کہوں

۱۷۴

پھر زُلفِ مسلسل کی شکن جاگ پڑی ہے
پھر حُسن میں جادو کی کرن جاگ پڑی ہے

معلوم نہیں پھول ہیں یا نقشِ کفِ پا
گزرا ہے کوئی راہِ چمن جاگ پڑی ہے

اب دِل کی نہیں خیر نہ لے نام وَفا کا
پھر وہ نگہہِ وعدہ شِکن جاگ پڑی ہے

پھر خون میں بیدار ہوا خواب حرارت
پھر غیرتِ اربابِ وطن جاگ پڑی ہے

اس دَور کی تہذیب بھی اِک نیند ہے گہری
کروٹ نہیں بدلی تو تھکن جاگ پڑی ہے

ساغر میں کوئی موج غنودہ نہ ملے گی
شیشوں میں بھی صہبائے کہن جاگ پڑی ہے

سُن سُن کے نشور آپ کے اشعار غم انگیز
بے خواب سا ہوں دل کی چبھن جاگ پڑی ہے

۱۷۵

یاد آتی رہی بُھلا نہ سکے
شمع جلتی رہی بُجھا نہ سکے

چاند تارے گُل و چمن مِل کر
دِل کی اِک داستاں سُنا نہ سکے

آس باندھی تھی جن ستاروں سے
دیر تک وہ بھی جگمگا نہ سکے

نغمہ کیا، مطربانِ عہدِ جدید
تار ٹوٹے ہوئے مِلا نہ سکے

آج وہ رہبرِ خلائق ہیں
خود کو جو آدمی بنا نہ سکے

پنجۂ گُل سے بھی یہ متوالے
دامنِ زندگی چھڑا نہ سکے

غم کے مارے ہوئے قلوب نشورؔ
دَرد کی سرحدوں کو پا نہ سکے

﴿۱۷۶﴾

گلِ رنگیں میں شعلے پل رہے ہیں
گلستانوں میں دامن جل رہے ہیں

گئی دُنیا مگر اربابِ دُنیا
ابھی تک دستِ حسرت مَل رہے ہیں

یہ سب ٹوٹے ہوئے ساغر ہیں ساقی
یہ جب تک چل رہے ہیں چل رہے ہیں

پشیماں تھے زمانے کے ستم بھی
تری زُلفوں میں جب تک بل رہے ہیں

ذرا اونچا ہو اے خورشید محشر
کہ دیواروں میں سایے پل رہے ہیں

درونِ میکدہ کیا کام ان کا
جنابِ شیخ سب کو کَھل رہے ہیں

نشورؔ اس دورِ طوفانِ خرد میں
چراغِ کعبہ اب تک جل رہے ہیں

۱۷۷

تارکِ رسمِ جفا بھی اب ستم ڈھانے لگے
لیجئے اتری کمانوں سے بھی تیر آنے لگے

کیا تعجب ہے کہ ہر رنگ چمن جاتے ہوئے
میرے اندازِ خزاں پر پھول برسانے لگے

گفتگو ہے ہوش کی اور جستجو ہے شوق کی
مجھ کو تو اہلِ خرد بھی جیسے دیوانے لگے

اپنی کمزوری بیاں کرتا ہے ہر دانش فروش
حضرتِ ناصح نہیں سمجھے تو سمجھانے لگے

زُلفِ آرام دل و جاں ہو کہ مرگِ ناگہاں
ایک ہی ناگن ہے جس کاندھے پہ لہرانے لگے

ایک آنسو اور اُس میں داستانِ صد ملال
کتنے دریا قطرۂ شبنم میں تھرّانے لگے

روشنی کوئی ہو، ہوتی ہے محبت آفریں
شمع کے پیچھے بھی ہیں دو چار پروانے لگے

ابتدا سے جو پلے تھے موج طوفاں خیز میں
جب وہی کشتی میں آ بیٹھے تو چکرانے لگے

جادۂ غم میں مِرے نقشِ قدم کو دیکھ کر
کارواں ٹھہرے ہوئے، آنے لگے جانے لگے

نیند کیسے آئے اس رنگین تصوّر میں نشورؔ
رات کو جب دِلرُباؤں کا خیال آنے لگے

﴿۱۷۸﴾

تیز تر لہجۂ گفتار کیا ہے ہم نے
برگِ گُل کو کبھی تلوار کیا ہے ہم نے

شعلۂ تیغ کو آغوشِ نظر میں لے کر
زیست میں موت کو بھی پیار کیا ہے ہم نے

کتنے منصوروں کا خوں دے کے ترے کوچے میں
احترامِ رسن و دار کیا ہے ہم نے

میکدہ والوں کو ساقی کا حوالہ دے کر
ایک آواز پہ ہُشیار کیا ہے ہم نے

غیر کے خام ارادوں کو کیا ہے پسپا
عزم کو آہنی دیوار کیا ہے ہم نے

امن کہتے ہیں جسے روح ہے آزادی کی
ایک عالم کو خبردار کیا ہے ہم نے

غیر کو پہلے ہی پہچان لیا تھا لیکن
ہوش میں آنے کو اِک وار کیا ہے ہم نے

خون کے داغ چٹانوں پہ جو پائے ہیں نشورؔ
چوم کر لالۂ کہسار کیا ہے ہم نے

﴿۱۷۹﴾

کبھی جھوٹے سہارے غم میں راس آیا نہیں کرتے
یہ بادل اُڑ کے آتے ہیں مگر سایا نہیں کرتے

یہی کانٹے تو کچھ خود دار ہیں صحنِ گلستاں میں
کہ شبنم کے لیے دامن تو پھیلایا نہیں کرتے

وہ لے لیں گوشۂ دامن میں اپنے یا فلک چُن لے
مری آنکھوں میں آنسو بار بار آیا نہیں کرتے

سلیقہ جن کو ہوتا ہے غمِ دوراں میں جینے کا
وہ یوں شیشے کو ہر پتّھر سے ٹکرایا نہیں کرتے

جو قیمت جانتے ہیں گردِ راہِ زندگانی کی
وہ ٹھکرائی ہوئی دُنیا کو ٹھکرایا نہیں کرتے

قدم میخانہ میں رکھنا بھی کارِ پختہ کاراں ہے
جو پیمانہ اُٹھاتے ہیں وہ تھرّایا نہیں کرتے

نشورؔ اہلِ زمانہ بات پوچھو تو لرزتے ہیں
وہ شاعر ہیں جو حق کہنے سے کترایا نہیں کرتے

۱۸۰

دِل ہے کہ محبت میں اپنا نہ پرایا ہے
کچھ سوچ کے اس نے بھی دیوانہ بنایا ہے

جو وقت کہ گزرا ہے جذبات کے کوچے میں
کچھ راس نہیں آیا کچھ راس بھی آیا ہے

آساں نہیں یہ آنسو آیا ہے جو پلکوں پر
رگ رگ سے لہو لے کر دیپک یہ جلایا ہے

اک ربطِ حسیں دیکھا بے ربطیِ عالم میں
ہنگامہ سہی لیکن ہنگامہ سجایا ہے

پہچان لیے ہم نے تیور غمِ دوراں کے
دُنیا میں رہا لیکن دھوکا نہیں کھایا ہے

رہبر ہو کہ شاعر ہو کیا اپنی خبر اس کو
خود کچھ بھی نہیں سیکھا، دُنیا کو سکھایا ہے

نغمہ ہے نشورؔ اپنا افسردۂ غم لیکن
احساس کی محفل میں کچھ رنگ تو آیا ہے

﴿۱۸۱﴾

دھڑکنیں دل کی گنے خوں میں روانی مانگے
زندگی عشق کی اے دوست جوانی مانگے

پیش کر داغ اگر دل پہ کوئی کھایا ہو
عشق ہر عاشقِ صادق سے نشانی مانگے

زُلف شبگوں ترے شانے پہ کھلی ناگن ہے
ڈس لے یہ جس کو نہ پھر اُٹھ کے وہ پانی مانگے

آدمی عہدِ جوانی میں رہا منکرِ غم
اب غمِ دل کی خبر ہے تو جوانی مانگے

حُسن ہر گام پہ قائم کرے اِک تازہ حجاب
عشق پردے کی یہ دیوار گرانی مانگے

دن کو سوتی ہے محبت کی کشش آنکھوں میں
رات کو چاند ستاروں کی کہانی مانگے

میکدہ میں مِرے ساقی کا نیا حکم یہ ہے
شام کو پیاس لگے صبح کو پانی مانگے

دلبری پیشہ ہے یہ چور بھی اپنے دل کا
آنکھ ہر ایک حقیقت سے چُرانی مانگے

کیا نئے دوست نوازوں کا بھروسا ہے نشورؔ
دوستی ہے کہ رہ و رسم پرانی مانگے

پرانی بات ہے اور تازہ عنوانوں سے کہنا ہے
کہ ٹکرائیں نہیں گردش میں پیمانوں سے کہنا ہے

محبت زندگی ہر نغمہ ہے اس خاک کی لَے میں
خلاؤں میں یہ دِل شاید ہو دیوانوں سے کہنا ہے

گلستانوں میں پھر فصلِ جنوں کو منتظر پایا
یہ دامن کام آئے اب گریبانوں سے کہنا ہے

ہوا جو ہم سے ٹکرائی وہیں اٹھکھیلیاں بھولی
ہمیں پہچان لیں پہلے یہ طوفانوں سے کہنا ہے

سراپا انتظار دستِ گلچیں ہے یہ شاخِ گل
چمن میں کیا نہیں یہ تنگ دامانوں سے کہنا ہے

نشورؔ اشعار میں شاید ہمیں پہچان لے کوئی
جو اپنوں سے نہ کہہ پائے وہ بیگانوں سے کہنا ہے

جب بھی آزاد تمدّن کا سوال آیا ہے
پہلے انسان کی عظمت کا خیال آیا ہے

جس کو اس دَور میں جینے کا خیال آیا ہے
موت کو سرحدِ ادراک پہ ڈال آیا ہے

درد و غم پر مرے ہنستے ہیں زمانے کے حسیں
جیسے احساس مروّت پہ زوال آیا ہے

تھا لہو تازہ محبت کا رگوں میں جس کی
دُور تک قصّۂ ماضی کو بھی ٹال آیا ہے

شاعری خود نگری ہے کہ وطن کا شاعر
خونِ دل اپنا زمانے میں اُچھال آیا ہے

خاک اور خون سے کھیلا ہے ہر اِک فردِ نشورؔ
جب کسی قوم کی عزّت کا سوال آیا ہے

﴿۱۸۴﴾

ہجومِ بے رُخی میں حسنِ ظن کی آزمائش ہے
وَفا کیسی مرے دِیوانہ پن کی آزمائش ہے

دِلوں کا توڑنا سیکھا ہے جس کی بے نیازی نے
محبت میں اُسی خاطر شکن کی آزمائش ہے

امینِ انتظارِ گام ہے راہوں کی خاموشی
زمانہ کچھ نہیں تیرے چلن کی آزمائش ہے

یہ انسانوں کے بے جاں قافلے اور دُوری منزل
کہاں تک ساتھ چل سکتا ہے فن کی آزمائش ہے

جہاں چھینٹیں لہو کی آ گئیں دامانِ انساں پر
وہیں صفحات تاریخِ وطن کی آزمائش ہے

بھڑک اُٹھا قریبِ شب کہ چھولے صبح کا دامن
سرِ محفل چراغِ انجمن کی آزمائش ہے

ہزاروں رنگ میں روح ایک ہے گلزار کی لیکن
بہ صد رنگی و یک رنگی چمن کی آزمائش ہے

نشورؔ اس عہدِ حاضر میں نئے جادو ہیں دانش کے
فسوں کاری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

﴿۱۸۵﴾

عہدِ حاضر میں جسے دیدہ وری کہتے ہیں
تیرے دیوانے اُسے کم نظری کہتے ہیں

عشق کو پیشۂ رندانِ ہنر مند کہو
دہر کو کار گہہِ بے ہُنری کہتے ہیں

برق سے مانگ کے لائے ہیں نگاہوں کا فریب
پرتوِ مرگ کو آئینہ گری کہتے ہیں

آج رندانِ قدح خوار بھی ہیں بادہ فریب
ہوش رکھتے ہیں مگر بے خبری کہتے ہیں

باغبانوں کی نظر میں جو کلی پھولی تھی
ہم اُسے فصلِ گلستاں نظری کہتے ہیں

زندگی کھو کے بھی اربابِ خرد کو نہ ملی
وہ محبت جسے شوریدہ سری کہتے ہیں

رات کے چاند ستاروں کو خبر کیا ہے نشورؔ
ہم جو افسانہ بہ آہِ سحری کہتے ہیں

۱۸۶

ماتم و غمِ خزاں تا چمن اِدھر بھی ہے
بوئے گل کا، کارواں، بے وطن اِدھر بھی ہے

حُسن اگر ہے اُس طرف محوِ نازِ دِلبری
عشق کے مزاج میں بانکپن اِدھر بھی ہے

شکوہ ہائے نوَ بہ نوَ سُن کے مُسکرا دیے
وہ لبِ حسیں ابھی کم سخن اِدھر بھی ہے

بخیہ کارِ وقت کو فرصتِ نظر کہاں
تار تار زیست کا پیرہن اِدھر بھی ہے

تیرے وعدے کا یقین ہے نشورؔ کو تو ہو
اپنا دِل تو بدگماں جانِ من اِدھر بھی ہے

۱۸۷

بہادُر شاہ ظفر

اے حریف چشمِ تر تجھ پر سلام
شاعرِ درد و اثر تجھ پر سلام

ہے لہو کے رنگ سے تیرا جمال
جادۂ خونِ جگر تجھ پر سلام

اے مسافر اے مہاجر اے اسیر
اے مرے شاہِ ظفر تجھ پر سلام

دیکھتا تھا آنے والی جنگ کو
قائدِ اہلِ نظر تجھ پر سلام

جنگِ آزادی کا تنہا رہنما
فخرِ راہ و راہبر تجھ پر سلام

ہے ترا پہلا سفر درسِ حیات
محوِ ایجادِ سفر تجھ پر سلام

مَے خانے میں بڑھتی گئی تفریقِ نہاں اَور
شیشے کا بیاں اور ہے ساقی کا بیاں اَور

انکارِ حقیقت بھی ہے اِک سیرِ حقیقت
ہوتا ہے یقیں اور تو بڑھتا ہے گماں اَور

رنگین فضاؤں میں ٹپکنے لگے آنسو
آیا ہوں گلستاں تو شبنم ہے چکاں اَور

اس درجہ بھی مایوس نہ دیکھی تھیں بہاریں
دُنیا میں ہیں اے دوست بہت ملکِ خزاں اَور

ہر گام نشوؔر آبلہ پائی کا ہے عالم
کچھ دُور ہے یہ قافلۂ دردِ رواں اَور

ماتم جواہر ۱۹۶۴

اشک جب مانگ کے شبنم کی دکاں سے آئے
خوں نہ کیوں دیدۂ خونابہ فشاں سے آئے

یہ سمجھ لو کہ کوئی تیز قدم گزرا ہے
گرد جب قافلۂ عمرِ رواں سے آئے

شہرِ خوباں کا یہ عالم ہے صرّافِ حیات
ہاتھ خالی ہی محبت کی دکاں سے آئے

بادہ لبریز ہو شیشے میں تو چھلکے صہبا
جام کیا انجمنِ شیشہ گراں سے آئے

کارنامے تھے جو اس کے نئی دُنیا میں عظیم
وہ بھی سننے میں حریفوں کی زباں سے آئے

ایشیا آج ہے بے نور سی آنکھوں کی طرح
روشنی دیدۂ مشرق میں کہاں سے آئے

۱۹۰

جواہر کے بعد

ظلمتِ شام کا چرچا ہی رہے گا کچھ دن
چاند ڈوبا ہے اندھیرا ہی رہے گا کچھ دن

آستیں کام نہ آئے گی نہ دامن کوئی
اشک پلکوں پہ لرزتا ہی رہے گا کچھ دن

ہم نوا زیست کا ملتا ہے کہیں صدیوں میں
آدمی جیسے اکیلا ہی رہے گا کچھ دن

ہم سفر چیخ کے سوجائیں گے ہر منزل پر
کارواں زیست کا لُٹتا ہی رہے گا کچھ دن

غم بھی کھانا کوئی چاہے تو نہ ممکن ہوگا
آدمی دہر میں بھوکا ہی رہے گا کچھ دن

ختم اِک دَور ہوا دوسرے دَور آنے تک
سانس رُک جانے کا دھڑکا ہی رہے گا کچھ دن

اس اندھیرے میں دیا کوئی ہے درکار نشورؔ
دل جسے کہتے ہیں جلتا ہی رہے گا کچھ دن

سب کے لیے کشش مرے طرزِ سخن میں ہے
کیا جانے کیا ادا مرے دیوانہ پن میں ہے

ہیں سرِ زمین غیر کے جلوے بھی بے فروغ
وہ گرد بھی حسیں ہے جو اپنے چمن میں ہے

میری نظر کے سامنے پوچھو نہ اُن کا رنگ
آئینہ ہے جو صبح کی پہلی کرن میں ہے

شیشے میں کون روک سکا ہے کرن نشورؔ
شاعر نہیں ہے وہ جو گرفتار فن میں ہے

اشک پلکوں پہ نہ ٹھہرے تو مداوا کیا ہے
یہ بھی طوفان کی منزل ہے کنارا کیا ہے

عشق اِک لمحہ ہے بے ماضی و بے مستقبل
شکوہ کیا چیز ہے یا وعدۂ فردا کیا ہے

وہ نگاہیں بھی پھریں جن سے تھی امیدِ وفا
کوئی سمجھا نہیں اے دوست کہ دُنیا کیا ہے

ایک معصوم سی فطرت ہے تغیّر بہ کنار
دل بدل جائیں تو دُنیا کا بدلنا کیا ہے

حُسن کیا چیز ہے پوچھو یہ مِری نظروں سے
آئینہ ہاتھ سے رکھ دو ابھی دیکھا کیا ہے

حاصلِ زیست بجز درد طلب کیا ہے نشورؔ
زندگی سے کسی فنکار نے پایا کیا ہے

۱۹۳

اُلجھن

لمحے اُلجھن کے قریب آپہونچے
سایے رہزن کے، قریب آپہونچے

آنسوؤں سے ہی بجھالے ناداں
شعلے دامن کے قریب آپہونچے

شیشۂ مے جو کبھی رقص میں تھے
سنگ و آہن کے قریب آپہونچے

کون مجرم کو بچا سکتا ہے
ہاتھ دامن کے قریب آپہونچے

اب تو اپنوں پہ بھروسا نہ رہا
دوست دشمن کے قریب آپہونچے

شور سن کر مری رُسوائی کا
وہ بھی چلمن کے قریب آپہونچے

ہم روایات کو پگھلا کے نشورؔ
اِک نئے فن کے قریب آپہونچے

۱۹۴

جو لوگ حقیقت کی ادا پائے ہوئے ہیں
ہر مصلحتِ وقت کو ٹھکرائے ہوئے ہیں

پھولوں کی طرح ہم بھی کھلے دل کے ہیں مالک
پیمانے میں جو کچھ بھی ہے چھلکائے ہوئے ہیں

راس آتی نہیں جن کو گلستاں کی فضا بھی
شاید کسی دامن کی ہوا کھائے ہوئے ہیں

انجامِ بہاراں کی اُنھیں فکر بہت ہے
دیوانہ ہوں میں اور وہ گھبرائے ہوئے ہیں

نام اس کا تبسّم ہو کہ اشکوں کا تسلسُل
دھوکا تو وہی ہے جو سبھی کھائے ہوئے ہیں

اس دَور کے رندوں کو زیاں کار نہ سمجھو
یہ لوگ بھی رحمت کا پتہ پائے ہوئے ہیں

شاعر کے خیالات نشورؔ اپنی حدوں میں
بادل ہیں بہت دُور تلک چھائے ہوئے ہیں

ہندوچین

اے ہجوم عاشقانِ انقلاب
ہوشیار از فتنۂ رنگیں نقاب

اپنی فطرت اِک نگاہِ احتیاط
اپنا شیوہ اِک ادائے اجتناب

غیر جانب دار ہے دھرتی کا خون
نا طرفداری ہے دُنیا کا شباب

ایٹمی طاقت پہ نازاں ہے حریف
ہند کی جمہوریت کا کیا جواب

اسلحہ کی قوتوں سے تیز تر
ایکتا کا یہ ہجومِ اضطراب

صلح کا پیغام اِک آوازِ غیب
امنِ عالم گیر اِک روشن کتاب

اوّل اوّل نقش باطل کی نمود
حق ہمیشہ آخر آخر کامیاب

ہے فسونِ تیرہ شب ہم سائیگی
سایہ گہرا ہو تو بہتر اجتناب

ہند کی جمہوریت کی روح میں
دیکھتا ہوں اِک نئی دُنیا کا خواب

کچھ دریچے دیکھتا ہوں برف میں
آگ کے شعلے ہیں اُن کا سدّ باب

غیر کی بد نیتی میں شک نہیں
جس کی نیت ہو چکی ہے بے نقاب

اِس طرف اِک شوکت آباد کار
اس طرف اِک لشکر خانہ خراب

خون الگ تہذیب الگ تعمیر الگ
چین والوں سے یہاں کیا انتساب

مستقل ہے نغمۂ تیغ و تفنگ
عارضی ہے وقفۂ چنگ و رباب

﴿۱۹۶﴾

ہندو پاک کشمکش

ہر وطن پرور وطن کے ساتھ ہے
پھول کوئی ہو چمن کے ساتھ ہے

مختلف رنگوں کی یہ اِک زندگی
روشنی بن کر کرن کے ساتھ ہے

اپنی تہذیب اپنی محفل کا سجاؤ
ربط شیخ و برہمن کے ساتھ ہے

وادیٔ کشمیر روشن ہم سے ہے
شمع اپنی انجمن کے ساتھ ہے

سب نے دیکھا ہے یہاں اس کا بہاؤ
یہ لہو گنگ و جمن کے ساتھ ہے

گفتگو ہو، صلح ہو یا جنگ ہو
جو ادا ہے بانکپن کے ساتھ ہے

صفحۂ تاریخ شاہد ہے نشورؔ
شرکت اپنی جان وتن کے ساتھ ہے

﴿۱۹۷﴾

زیست ملتی ہے عمرِ فانی سے
مانگ کچھ اپنی زندگانی سے

اِک نظر کا فسانہ ہے دُنیا
سو کہانی ہے اِک کہانی سے

بات کہہ دی تو بات کچھ نہ رہی
غم ہوا غم کی ترجمانی سے

صبح ہوتی نہیں محبت کی
رات کٹتی نہیں جوانی سے

پھول چُنتے ہیں اہلِ بزم نشورؔ
میری ہر تازہ گلفشانی سے

﴿۱۹۸﴾

وقت کا قافلہ آتا ہے گزر جاتا ہے
آدمی اپنی ہی منزل میں ٹھہر جاتا ہے

ایک بگڑی ہوئی قسمت پہ نہ ہنسنا اے دوست
جانے کس وقت یہ انسان سنور جاتا ہے

اُس طرف عیش کی شمعیں تو اِدھر دل کے چراغ
دیکھنا یہ ہے کہ پروانہ کدھر جاتا ہے

جام و صہبا کی مجھے فکر نہیں اے غمِ دل
میرا پیمانہ تو اشکوں ہی سے بھر جاتا ہے

ایک رشتہ بھی محبت کا اگر ٹوٹ گیا
دیکھتے دیکھتے شیرازہ بکھر جاتا ہے

حال میرے لیے ہے لمحۂ آیندہ نشورؔ
وقت شاعر کے لیے پہلے گزر جاتا ہے

گل افشانیِ گفتار

۱۹۶۹ء

سے

۱۹۷۷ء

تک

﴿۱۹۹﴾

رُخ بدلتے ، راہ چلتے ،گُل عذاروں کو نہ چھیڑ
اے چمن ناآشنا رنگیں بہاروں کو نہ چھیڑ

لالہ و گُل میں بھی تجھ کو مسکرانا ہے مگر!
ہر چمن میں مسکرا کر غم کے ماروں کو نہ چھیڑ

شامِ غم ہے ماہ و انجم کی طرف مڑ کر نہ دیکھ
رات کی تاریکیوں میں چاند تاروں کو نہ چھیڑ

ہم نہ برگِ گل نہ شبنم نے خس و خارِ چمن
اے نسیم صبح جا، ہم خاک ساروں کو نہ چھیڑ

وہ کرم نا آشنا ہوں تو کرم فرما سمجھ
اِک سہارا ٹوٹتا ہے اعتباروں کو نہ چھیڑ

کانپتے ہونٹوں سے ناداں نامِ رسوائی نہ لے
دِل دھڑکتا ہو تو دامن کے کناروں کو نہ چھیڑ

سُن کے اشعارِ نشورؔ اے دوست تنقیدیں نہ کر
گرتے دریا ہیں یہ ظالم ، آبشاروں کو نہ چھیڑ

﴿۲۰۰﴾

سلسلہ حُسنِ تغافل کا وفا ہے یہ بھی
میں نے اِک جانِ تمنّا سے سُنا ہے یہ بھی

صفحۂ شامِ الم پر یہ چراغوں کی لکیر
خونِ دل سے کوئی افسانہ لکھا ہے یہ بھی

کتنی افسردہ و بے کیف ہے صہبائے خودی
پھینک دے جام سے ساقی کہ دوا ہے یہ بھی

چشمِ نم کا یہ مسافر بھی تھکا راہی ہے
رات بھر چل کے تو پلکوں پہ رُکا ہے یہ بھی

ساقیا شام یہ کہتی ہے کہ اُٹھ جام بدست
بعد مدّت کے تو اِک وقت پڑا ہے یہ بھی

اب نہ نالے ہیں نہ شکوے ہیں نہ بے تابیٔ شوق
دِل سے کچھ بات نہ کرنا کہ خفا ہے یہ بھی

زاہد کہنہ روا پر بھی نہ ہنسنا اے دوست
ڈھونڈتے ڈھونڈتے کعبہ میں مِلا ہے یہ بھی

آدمی بستۂ زنجیرِ تعلّق ہے نشورؔ
زندگی نام ہے، تسلیم و رضا ہے یہ بھی

ان سُرمگیں آنکھوں میں آنسو پسِ مژگاں ہے
کچھ دُور اندھیرا ہے، کچھ دُور چراغاں ہے

پلکوں پہ اُسے اے غم کچھ دیر لرزنے دے
یاں ایک ستارا ہے وہ بھی سرِ مژگاں ہے

اے گردِ رہِ دانش تو تیز قدم ہوجا
میں نکہتِ گلشن ہوں میرا سفر آساں ہے

شاعر کو نشورؔ آخر فرصت نہ ملی غم سے
یا زُلف پریشاں تھی یا فکرِ پریشاں ہے

ہم، سایۂ مہتاب میں پالے بھی گئے ہیں
اور کتنی بہاروں سے نکالے بھی گئے ہیں

رہبر ہی کا احسان نہیں راہِ جنوں پر
کچھ دُور مرے پانْو کے چھالے بھی گئے ہیں

ہے جادۂ تخئیل میں اِک چھانْو سی اب بھی
اس راہ سے کچھ گیسوؤں والے بھی گئے ہیں

ہر سانس محبت کی ہے اِک بوجھ اَلم کا
دیوار گری ہے تو سنبھالے بھی گئے ہیں

اشعار مرے سُن کے نشورؔ آپ نے دیکھا
اِک شعر وہ آنکھوں میں چُرالے بھی گئے ہیں

۲۰۳

کچھ زمانے کی ہوا یوں تیز تر ہوتی گئی
ہر کلی جو بے خبر تھی باخبر ہوتی گئی

عشق کا ہر ایک آنسو رایگاں جاتا رہا
عقل کی ہر مسکراہٹ معتبر ہوتی گئی

کوئی ساتھی راہ کا مجھ کو نہیں پہچانتا
زندگی تنہا مسافر کا سفر ہوتی گئی

وقت اِک معشوقۂ رنگیں ادا، سادہ لباس
رات جب کپڑے بدل آئی، سحر ہوتی گئی

حسن کے پردے میں قائم ہے رقابت کا نظام
غیر کو دِل کے دھڑکنے کی خبر ہوتی گئی

کعبہ ویراں، میکدوں میں اہلِ ایماں کا ہجوم
پہلے جو دُنیا اِدھر تھی وہ اُدھر ہوتی گئی

سینۂ احساس میں آتش فسردہ تھی نشورؔ
شاعری بے سوز و بے خونِ جگر ہوتی گئی

تری عنایت سے چشمِ ساقی حیات کا بانکپن ملا ہے
ہزار پیمانے توڑ ڈالے تو ذوقِ عالم شکن ملا ہے

مہکتی راتوں، بہکتی باتوں سے زندگی کا چلن ملا ہے
کسی کو عقل و خرد ملی ہے کسی کو دیوانہ پن ملا ہے

وفا سے پہلو بچانے والے ملے بریشم کے بستروں میں
وہیں پہ حق بات کہنے والا قریبِ دار و رَسَن ملا ہے

نظر کے جادو میں ہے وہ قوت کہ دستِ نازک اُٹھالے تیشہ
جہاں نہیں ہے غمِ محبت، تھکا ہوا کوہکن ملا ہے

چمن میں کچھ دن خموش رہ کر گلوں نے پائی زبانِ نکہت
جو اس طرح کم سخن ملا ہے اسے کمالِ سخن ملا ہے

اُداس ہے زیست کا نظارا نشورؔ جلتا ہے دِل ہمارا
کبھی کبھی شہرِ آرزو میں چراغِ بے انجمن ملا ہے

نہ راستے کا پتہ ہے نہ منزلوں کا نشاں ہے
میں مُڑ کے دیکھ رہا ہوں گزشتہ عمر کہاں ہے

تہی پیالہ ہے میرا، تری شراب سے بہتر
خطا معاف ہو ساقی، یہ ذوقِ تشنہ لباں ہے

محبّتوں کے یہ تیور کہ بے نیاز ہے عاشق
جوانیوں کا یہ عالم کہ التفات گِراں ہے

دِلِ حیات کے اندر کھٹک رہا ہے یہ نشتر
خبر نہیں کہ کہاں تک نظامِ غمزہ رواں ہے

کوئی قریب نہ آئے کہ فیضِ خاص ہے جاری
کوئی اِدھر سے نہ گزرے کہ کوئے پیرِ مغاں ہے

جب آ گئے ہو تو ٹھہرو متاعِ جاں بھی پرکھ لو
یہاں کوئی نہیں ٹھہرا، یہ کوچہ، کوئے بتاں ہے

مِرا بیان، تجلّی مِرا خیال، درخشاں
زمینِ شعر پہ میری، نمِ ستارہ چکاں ہے

حیات ایک قدم ہے نگاہ ایک ارادہ
سفر تمام ہو لیکن، نظر تمام کہاں ہے

نشورؔ یہ بھی کنایہ ہے اِک اشارۂ غم کا
تجھے پتا نہیں ہمدم، غزل، غزل کی زباں ہے

﴿۲۰۶﴾

سب ہیں اُدھر ہی حُسن جدھر ہے
جلوہ نہیں پیغامِ نظر ہے

کوئی نہ سمجھا راز جنوں کا
جس کو خبر ہے، اس کو خبر ہے

جتنے آنسو اتنی ہی منزل
ایک محبت لاکھ سفر ہے

کوئی نہیں ہے بزم جہاں میں
آئینہ ہے اور آئینہ گر ہے

تم نہ اُڑاؤ گردِ کدورت
یوں ہی زمانہ خاک بسر ہے

ایک فسانہ برقِ تبسّم
ایک کہانی دیدہ تر ہے

اور پلا دے ساقیِ دوراں
ہوش نہیں تو ہوش کا ڈر ہے

شعرِ نشورؔ اور طرزِ تکلّم
یہ بھی متاعِ اہلِ نظر ہے

﴿۲۰۷﴾

اِک مست ادا کی یاد سے کچھ ٹوٹا ہے خمارِ نیم شبی
وہ قامتِ رنگیں بنتِ عِنَب، وہ چشمِ حسین بنت العنبی

اِک دل کا محبت نام پڑا، اِک غم کو تغافل کہنے لگے
فطرت نے بکھیرے کچھ شعلے کچھ آگ لگی کچھ آگ دبی

اِدراک مشیّت ہے یہ بھی، ہم تم جو ارادہ کرتے ہیں
اسباب و علل کی یہ دُنیا تفسیر جہانِ بے سببی

غم کیا ہے غموں سے ربط ہے کیا بے لوث تبسّم کیا سمجھے
وہ سادہ ادا وہ سادہ نظر کیا جانے فسونِ غنچہ لبی

دُنیا کی زبانیں کچھ بھی کہیں فطرت ہے نشورؔ آخر فطرت
ہے میری زباں کا طُرّہ ابھی اُردو لقبی ہندی نسبی

مری پلکوں کو اب اشکِ غمِ دل چھو نہیں سکتا
یہ طوفاں اپنی بے تابی میں ساحل چھو نہیں سکتا

حیات اِک رہ گزر اور آدمی زخمی مسافر ہے
یہ راہی آبلہ پائی میں منزل چھو نہیں سکتا

زمانہ آج بھی آمادۂ منصف مزاجی ہے
مگر کچھ سوچ کر دامانِ قاتل چھو نہیں سکتا

جہاں میں نامکمل جلوہ اپنا دیکھئے یوں ہی
یہ وہ آئینہ ہے جس کو مقابل چھو نہیں سکتا

نشورؔ اپنی بھی طبعِ تیز سے ہُشیار رہنا ہے
دمِ شمشیر کو، کوئی بھی غافل چھو نہیں سکتا

عشق کی طبیعت میں سادہ پن سا ہوتا ہے
ہر ستم کے آخر میں حُسنِ ظن سا ہوتا ہے

چُھپ کے مُسکراتا ہے جو مِری تمنّا پر
غنچگانِ محفل میں کم سخن سا ہوتا ہے

شمعِ فکر جلتی ہے شہرِ دل نوازاں میں
شاعر اپنی دُنیا میں انجمن سا ہوتا ہے

شام کو جمال ان کا پرتوِ مہ و انجم
رات کو خیال اُن کا گُل بدن سا ہوتا ہے

مے کدہ میں دیکھا ہے مے گسار کو تو نے
اِک کلی اُٹھاتا ہے اور چمن سا ہوتا ہے

اصل شے سہارا ہے درد و غم کی دُنیا میں
آدمی وطن میں بھی بے وطن سا ہوتا ہے

چارہ گر نشورؔ اپنا سوز و ساز کیا جانے
دِل کا ایک عالم بھی دِل شکن سا ہوتا ہے

﴾۲۱۰﴿

نہ تبسّم نہ تکلّم نہ ادا ہوتی ہے
یہ بھی اِک وقت ہے، رنگیں جو فضا ہوتی ہے

قتل گہہ کچھ نہیں اے دوست مگر یہ کہ وہاں
آخری رسم محبت کی ادا ہوتی ہے

دوش پر چاند ستاروں کے نکھرتا ہے جمال
رات صدیوں میں کہیں زُلفِ دوتا ہوتی ہے

خیمۂ گل میں کہاں فطرتِ رنگیں کو قرار
نکہت آوارہ ہے، بدنام صبا ہوتی ہے

جو کہا آہِ سحر گہہ نے وہی ہو کے رہا
بے کسی اپنی پیمبر کی دُعا ہوتی ہے

کچھ زمانہ بھی موافق نہیں شاعر کے نشورؔ
خلق بھی دشمنِ ہر تازہ نوا ہوتی ہے

ذوقِ غم بھی ساغرِ عصرِ نو میں ڈھل گیا
زندگی کے نام سے آدمی بدل گیا

بزم میں ہمیشہ ہے زندگی کی لَو مگر
یہ چراغ بجھ گیا، وہ چراغ جل گیا

گوشۂ نگاہ میں زندگی جواں ہوئی
گیسوؤں کی چھانْو میں انقلاب پل گیا

میری ان کی دوستی عکس و آئینہ سمجھ
سامنا ہوا مگر رُخ بدل بدل گیا

وقت کو بُرا نہ کہہ انتظار شرط ہے
ہر ندی جواں ہوئی ہر پہاڑ ٹل گیا

مجھ کو فکرِ شعر سے کچھ ملا نہیں مگر
غمزدہ تھا دِل نشورؔ شعر میں بہل گیا

اپنی بھی داستانِ محبت یوں ہی چلی
کچھ دن وہ ملتفت نہ ہوئے بے رُخی چلی

گزرا تھا اُس گلی سے کہ زخمی ہوئی حیات
جانے کہاں سے پھول گرے، پنکھڑی چلی

کہنے کو بے وفا ہے نسیمِ سحر مگر
مُڑ مُڑ کے وہ بھی سوئے چمن دیکھتی چلی

تاریک تر ہیں کوچۂ مشرق کے پیچ و خم
روشن ہوا جہاں تو ادھر روشنی چلی

آخر کو منزلِ غمِ دوراں میں رہ گئی
دو چار گام ساتھ مِرے زندگی چلی

جب راہ رَو سنبھل کے اُٹھانے لگے قدم
رہبر سمجھ گیا کہ مِری رہبری چلی

پھولوں کی انجمن کا وہاں ذکر کیا نشورؔ
کانٹوں پہ پانْو رکھ کے جہاں زندگی چلی

﴿۲۱۳﴾

کوئی سمجھا رُموزِ دلبری کم
وہ ظالم اجنبی اور اجنبی کم

ابھی کچھ کہتے کہتے رُک گئے وہ
کلی جیسے کِھلی، لیکن کِھلی کم

یہ کیا ہے اے خدائے عشقِ جاں سوز
محبت دی زیادہ، زندگی کم

یہ توبہ اور توبہ کی نمایش
غرورِ بندگی ہے، بندگی کم

نشورؔ اس دَور کا فن بھی ہے جاں کاہ
گراں باری زیادہ، شاعری کم

بُتانِ دَورِ سیاست سے ربط کم ہے یہاں
خودی کا کوئی تصوّر بھی ہو صنم ہے یہاں

سوائے شوق نہیں کچھ بھی عرض کے قابل
حضورِ دوست ہر اِک جلوہ متّہم ہے یہاں

نوائے اوجِ انا بھی اِک ابتدائے شعور
مقامِ دار و رَسن اوّلیں قدم ہے یہاں

مری نگاہ کا اِک گوشہ دانش، حاضر
جہاں دراز جہاں، اِک جزوِ غم ہے یہاں

زمانہ ویسے تو مخلوق ہے مِری ہی طرح
مگر وہ خالقِ اسبابِ کیف و کم ہے یہاں

ہے میرے گناہوں پر رحمت کی گھٹا چھائی
کیا جانیے قدرت کو کیا بات پسند آئی

بیدار تھیں جو آنکھیں کچھ اُن کو بھی نیند آئی
ہیں شام کے کاجل سے صُبحیں ابھی کجلائی

گُل چاک گریباں ہیں، بادِ سحری شاید
دیوانوں کی محفل سے اِک بات اُڑا لائی

اُس بزمِ تغافل میں شکوہ مرا کام آیا
میں جا کے منا لایا روٹھی ہوئی تنہائی

خود اس کی تجلّی بھی ہے محوِ سفر شاید
آئینہ بہ آئینہ یکتائی بہ یکتائی

جیسے کوئی مہوش ہو، کچھ مائلِ خمیازہ
یوں ہی یہ تمنّا ہے ٹوٹی ہوئی انگڑائی

انجامِ وفا یہ ہے جس نے بھی محبت میں
مرنے کی دُعا مانگی، جینے کی سزا پائی

ملتا ہے نشورؔ اکثر اِک فکرِ گُل افشاں میں
باقی ہے ابھی جیسے ذوقِ چمن آرائی

﴿۲۱۶﴾

اِک کشمکشِ غم ہے اور شوق کی منزل ہے
دامن بھی بچانا ہے شعلہ بھی مقابل ہے

آنکھیں ہیں ستارے ہیں وقتِ خلشِ دِل ہے
دن ہو تو گزر جائے رات آئی تو مشکل ہے

ہستی ہے سفر لیکن احساس نہیں ہوتا
ہر سانس مسافر ہے، رستہ ہے نہ منزل ہے

مجروحِ غمِ دوراں فریاد کرے کس سے
زخمی ہے جہاں دُنیا خنجر ہے نہ قاتل ہے

جوشِ گُلّ و گلشن میں یہ رنگ کہاں ہوتا
جیسے کہ لہو میرا اس رنگ میں شامل ہے

یوں تیز قدم چلنا آساں تو نہیں لیکن
منزل پہ جو پہنچا ہے آوارۂ منزل ہے

ہر گوشۂ ارماں میں غم اور ہجومِ غم
تم اس میں کہاں آئے یہ انجمن دل ہے

الفاظ و عبارت میں شاید کوئی پہچانے
شاعر ہی نشورؔ اپنے اشعار کا حاصل ہے

﴿۲۱۷﴾

شبِ غم مِری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا
نہ کہیں ترا ٹھکانہ نہ کہیں مِرا ٹھکانا

کوئی آج تک نہ سمجھا کہ شباب ہے تو کیا ہے
یہی عمر جاگنے کی، یہی نیند کا زمانا

جو ذرا سی آنکھ کھولی تو ہزار حشر دیکھے
یہ خودی جو سو رہی ہے اسے اب نہ پھر جگانا

جلووں کو سمیٹے ہوئے وہ بچ کے چلے کیوں
جادو مگر اُن گھنی پلکوں کے تلے کیوں

اب اوج پہ آئے ہیں اُمیدوں کے ستارے
اے گیسوئے شب رنگ ابھی رات ڈھلے کیوں

دولت سے بڑی چیز ہے دولت کی نمایش
یہ خونِ خلایق ہے تو چہرہ پہ مَلے کیوں

نیکی و بدی میں بھی کوئی ربط ہے گہرا
وہ دھوپ سہی چھاؤں سے ملتی ہے گلے کیوں

آنسو ہیں نشورؔ اُن کے مقابل میں بُجھے سے
اُن کے رُخِ روشن کے قریں شمع جلے کیوں

یہ طرزِ تغافل ہے یا حُسنِ عنایت ہے
وہ شکوہ نہیں سنتے آہوں کی اجازت ہے

ہم ان کو بلائیں کیوں اچھا ہے خفا ہیں وہ
آئیں تو قیامت ہے جائیں تو قیامت ہے

پھر دیدۂ پر نم پر مائل بہ تبسّم ہیں
پروردۂ گلشن ہیں کلیوں کی سی عادت ہے

رَگ رَگ میں محبت کی کم کم ہے لہو لیکن
دل اب بھی دھڑکتا ہے دیوانہ سلامت ہے

نقّاد سے ، دلبر سے ، احباب سے، دُنیا سے
شاعر کو نشورؔ آخر کس کس سے شکایت ہے

﴿۲۲۰﴾

بار بار کلیوں میں غنچگی نہیں آتی
اِک ہنسی تو ممکن ہے دوسری نہیں آتی

حسن و عشق دونوں ہی ہیں گرفت میں دِل کی
غم کی گرم بانہوں کو نازکی نہیں آتی

کچھ نہیں تو کلیوں کو مسکرا کے چھیڑیں گے
ان حَسین ہونٹوں کو خامشی نہیں آتی

ایک قطرہ آنسو بھی ضبطِ غم سے باہر ہے
زندگی کے دامن میں زندگی نہیں آتی

بزم میں بکھیرے ہیں آفتاب کے ٹکڑے
دن کی بات کرتا ہوں رات کی نہیں آتی

موت کا گزر کیا ہے بزمِ ہوشمنداں میں
آنکھ ہے کھلی جب تک نیند بھی نہیں آتی

مے کدہ پکارے ہے چُھپ کے پینے والوں کو
بے شریکِ پیمانہ مے کشی نہیں آتی

ہے نشورؔ ہر لمحہ مغتنم محبت کا
جو گھڑی گزرتی ہے پھر کبھی نہیں آتی

حُسن کو دیکھا ہے اکثر تو نے عریانی پسند
فطرتِ ہر شاخ تازہ ہے گل افشانی پسند

کتنے آئینے لگائے ہیں خیالِ دوست نے
دِل میں اِک تصویر ہے ہر لمحہ حیرانی پسند

ہر قدم پر ایک لغزش، ہر نظر اِک مرحلہ
دل کو کیا کہیئے کہ ہے ہر لحظہ نادانی پسند

ہے غزل گوئی نشورؔ اِک زندگانی کا گداز
شاعری خونِ جگر دُنیا زباں دانی پسند

شب خمارِ نگہِ یار تک آ پہنچی ہے
گفتگو ساغرِ سرشار تک آ پہنچی ہے

رنگ چہرے کا بتاتا ہے کہ دل کی وہ آنچ
ہلکی ہلکی ترے رخسار تک آ پہنچی ہے

تجھ سے بیگانہ نہیں دل میں تری یاد مگر
یہ محبت ہے جو انکار تک آ پہنچی ہے

کتنے رنگین فسانوں کا بنی ہے عنواں
وہ شکایت جو لبِ یار تک آ پہنچی ہے

نکہتِ گُل سے اُٹھا شور سا گلزاروں میں
اب یہ زنجیر بھی جھنکار تک آ پہنچی ہے

اب تو اس کوچہ میں بھی چین نہیں اے غمِ دل
آگ اِک سایۂ دیوار تک آ پہنچی ہے

جب کوئی راز محبت کا ہوا ہے افشا
بات کھنچتی ہوئی تلوار تک آ پہنچی ہے

میرے افسانے بھی دُنیا کی زبانوں سے سنو
بے زبانی مِری گفتار تک آ پہنچی ہے

آج سچّا نہیں شاعر کے سوا کوئی نشورؔ
شاعری عظمتِ کردار تک آ پہنچی ہے

﴿۲۲۳﴾

رنگ کلی کا اُڑ چلے، گُل کا خمار چھوٹ جائے
وہ جو چمن فروز ہوں نبضِ بہار چھوٹ جائے

بادۂ سوز و ساز بھی جرعہ بہ جرعہ چاہیے
ایسی بھی بے خودی نہ ہو دامنِ یار چھوٹ جائے

وہ جو چلیں تو ساتھ ہوں انجم و ماہ و کہکشاں
پیچھے کہیں ہجوم میں فصلِ بہار چھوٹ جائے

رہبرِ منزل خرد ایسی بھی کیا ترقیاں
ہونٹ سے گر پڑے ہنسی، آنکھ سے پیار چھوٹ جائے

قافلۂ سخن خجل اپنی نظر کی چوک پر
راہ میں فطرتِ نشورؔ نادرہ کار چھوٹ جائے

﴿۲۲۴﴾

کون ہیں ہم البیلے راہی کیا جانیں بے چارہ لوگ
رونقِ کوئے لالہ رُخاں ہیں ہم ہی کچھ آوارہ لوگ

چلتے پھرتے راہ گزر میں دیکھ لیں اس رہزن کو اگر
میرا گریباں چھوڑ کے اپنا دامن کرلیں پارہ لوگ

کہتے ہیں ہم عصر ہمارے نغمہ بھی دانش ہے لیکن
شعر و غزل کا نام نہ لینا شاعر ہیں آوارہ لوگ

بحرِ رواں کی موجیں گننا نام اسی کا جینا ہے
بھول گئے آغازِ محبت لہر گنیں دوبارہ لوگ

شام سے اپنی تیرہ شَبی پر جب بھی آہیں کی ہیں نشورؔ
شمع جلا کر، شمع بجھا کر، سو نہ سکے مہ پارہ لوگ

﴿۲۲۵﴾

غمزدہ ہوں مجھ کو ہے طرزِ سکونِ دل بہت
ورنہ ہیں اے ہم نشیں اس شہر میں قاتل بہت

زُلف شبگوں، روئے رنگیں اور نگاہِ دِلنواز
ایک ہی تصویر میں ہیں دشمنانِ دل بہت

ہر تجلّی اِک تواضع ہر تبسّم اِک لگاؤ
پھر بھی ہے اے دوست احساسِ شکستِ دل بہت

میں سفالِ عصر حاضر کا نہیں ذوق آشنا
یا مِرے ساغر میں ہے صہبائے مستقبل بہت

زندگی تھی تازہ دَم شورِ تلاطم تک نشورؔ
رُک گیا طوفاں تو اب خاموش ہے ساحل بہت

بیک نظر یہ حقیقت سمجھ میں آئی ہے
حیات کچھ بھی نہیں ، اپنی دِلرُبائی ہے

جُھکی ہوئی ہے وہ زُلفِ سیاہ آنکھوں پر
گھٹا یہاں بھی کسی مے کدہ پہ چھائی ہے

وہی فریب ہے گندم کا اور وہی آدم
اگرچہ میں نے یہ جنت نئی بنائی ہے

اُس انجمن میں رہا اور انھیں سے مِل نہ سکا
ہجومِ انجمنِ ناز کی دُہائی ہے

نگاہِ ساقیِ نامہرباں کا طور نہ پوچھ
جہاں گئی کوئی پیمانہ توڑ آئی ہے

نشورؔ مست نگاہوں کا راز کیا کہیے
ان انکھڑیوں نے کسی کی غزل چُرائی ہے

رہِ جنوں و خرد تم نے روک رکّھی ہے
نگاہ بھی مہ و انجم نے روک رکّھی ہے

ہزار بار خزاں آئی اور گئی ناکام
بَہار تیرے تبسّم نے روک رکّھی ہے

ہنسی لبوں پہ تو آنکھوں میں شوق کی برسات
کبھی تو ہم نے کبھی تم نے روک رکّھی ہے

جو دوستی کی روش رہ گئی تھی دُنیا میں
وہ زندگی کے تصادم نے روک رکّھی ہے

نجات سب کے لیے تھی مگر بہشتِ بریں
فریبِ دانۂ گندم نے روک رکّھی ہے

فلک پہ چاند ستارے ٹھہر گئے ہیں نشورؔ
یہ رات میرے ترنّم نے روک رکّھی ہے

﴿۲۲۸﴾

جلوہ اپنی ذات کی رعنائیوں کا نام ہے
زندگی شاید انھیں تنہائیوں کا نام ہے

زُلف و رُخ، شام و سحر، حسنِ تخیّل، ذوقِ شعر
شاعری بکھری ہوئی رعنائیوں کا نام ہے

ہے شبابِ زندگی بھی آمدِ فصلِ جنوں
حسن موسم ہے، ادا پُروائیوں کا نام ہے

خاک کے پردے پہ ہے رنگ تجلّی کی نمود
زندگی چلتی ہوئی پرچھائیوں کا نام ہے

شعلہ معمور نگاہ و جلوہ مخلوقِ خرام
حُسن بھی مجبور سی انگڑائیوں کا نام ہے

کائنات اِک رازِ عریاں ہے کہ حُسنِ کائنات
سطح پر آئی ہوئی گہرائیوں کا نام ہے

دِل کے ہنگامے سے ہے رنگِ تغزل بھی نشورؔ
غم بھی گویا انجمن آرائیوں کا نام ہے

۲۲۹

مشیّت

گُل و شاخِ گُل کو رنگِ مئے خام دے دیا ہے
جسے کچھ نہیں مِلا تھا اُسے جام دے دیا ہے

کہیں آرزوئے مبہم، کہیں دردِ ہجرِ پیہم
مری ہر ادائے غم کو، کوئی نام دے دیا ہے

ہے امانتِ تجلّی یہ ہجومِ ماہ و انجم
کہ سحر نے نوُر اپنا سرِ شام دے دیا ہے

ستمِ حیات دیکھو کہ بجائے سروِ گلشن
کسی فتنۂ قیامت کو خرام دے دیا ہے

یہ صبا کے نرم جھونکے اسے پھر سُنا رہے ہیں
مری خاکِ بے وطن نے جو پیام دے دیا ہے

مجھے دی ہے ایک قسمت مَیں بناؤں یا بگاڑوں
جسے جو دیا ہے اُس نے بہ تمام دے دیا ہے

کسی جزو کو چمن میں نہیں بے نصیب چھوڑا
گُل و غنچہ و صبا کو، کوئی کام دے دیا ہے

سفرِ حیاتِ غم میں یہی فن ہے میرا توشہ
مجھے کچھ نہیں دیا تھا تو کلام دے دیا ہے

۲۳۰

کُل مے کدہ تشنہ کام سا ہے
ساغر میں خدا کا نام سا ہے

عالم میں کہاں سکونِ خاطر
دِل سینے میں بے مقام سا ہے

گہری ہوئی رات اور گہری
پیمانے میں رنگِ شام سا ہے

ساقی ہے اُداس دورِ آخر
منظر بھی شکستِ جام سا ہے

توبہ کا ابھی سے یہ ارادہ
کچھ نیتِ شب حرام سا ہے

ہے عمر صبا کا ایک حصّہ
ہر غنچہ سبک خرام سا ہے

ہم دیکھیں تو ایک جُرمِ وحشت
وہ دیکھیں تو قتلِ عام سا ہے

ہر ذرّہ نشورؔ ہے سفر میں
کہنے کو یہاں قیام سا ہے

۲۳۱

نورِ قمر نے میرے لیے اِک رشکِ قمر کو روک لیا ہے
اوّلِ شب سے آخرِ شب تک، جس نے نظر کو روک لیا ہے

اُن کے خرامِ ناز کے آگے تھم سی گئی ہے گردشِ عالم
زُلفِ حَسیں نے، نورِ جبیں نے شام و سحر کو روک لیا ہے

تم نے بنائے لاکھوں شیشے عکس کسی میں بھی نہیں ٹھہرا
دِل نے بنا کر آئینۂ غم، آئینہ گر کو روک لیا ہے

پی کے بہکتا کوئی نہیں ہے فکرِ نگوں کا نام ہے مستی
شیشۂ مے نے قافلہ ہائے فکر و نظر کو روک لیا ہے

اپنا نشورؔ انداز جدا ہے فکرِ حسیں سے آہِ رسا تک
ہم نے فضائے لالۂ و گل میں برق و شرر کو روک لیا ہے

۲۳۲

سازِ شکستہ کیا ہے ابھی تم کو کیا خبر
دورِ خزاں ہے موجِ تبسّم کو کیا خبر

آنسو کب آ گئے ہیں محبت کو کیا پتا
کشتی میں کون ہے یہ تلاطم کو کیا خبر

آواز کس کی ہے پسِ آئینہ کون ہے
ان طائرانِ مشق تکلّم کو کیا خبر

اب کوئی موج سر بھی اُٹھاتی نہیں نشورؔ
دریا ہی سو گیا ہے تلاطم کو کیا خبر

غزل بر طرح غالبؔ

جشن غالب منعقدہ لال قلعہ دہلی ماہ فروری ۱۹۶۹ء

حُسن کو عشق کے انداز سکھائے نہ بنے
آخرِ شب کوئی روٹھے تو منائے نہ بنے

دِل کے ہر راز کا اظہار تو کب ہے ممکن
سو رہی ہو کوئی حسرت تو جگائے نہ بنے

تنگ دامانیِ گلچیں ہے یہاں تک مشہور
پنکھڑی ان سے گلستاں کی اُٹھائے نہ بنے

اُن کے دامن کی ہواؤں نے کیا ہے مدہوش
ہوش آتا ہے مگر ہوش میں آئے نہ بنے

کیا خبر جشنِ مئے ناب کی غالبؔ کو نشورؔ
ایسا سویا ہے یہ شاعر کہ جگائے نہ بنے

یہ آنسو جو پلکوں پہ آئے ہوئے ہیں
ستارے یہاں سر جھکائے ہوئے ہیں

کرن پھوٹتی ہے لب و زُلف و رُخ سے
تمام آئینے جگمگائے ہوئے ہیں

خیالوں کی دُنیا بھی اِک زندگی ہے
وہ آئے نہیں اور آئے ہوئے ہیں

وہ کوئے حرم میں تو ہم مے کدہ میں
چراغ اپنا اپنا جلائے ہوئے ہیں

گُلوں کی طرح ہم اسیرانِ گلشن
خود اپنے لہو میں نہائے ہوئے ہیں

نشورؔ ان دنوں شعر گویانِ عالم
خیالات سطحی سجائے ہوئے ہیں

۲۳۵

یوں ہیں میرے شعروں میں جھلکیاں خیالوں کی
آئینہ میں شکلیں ہوں جیسے خوش جمالوں کی

نیم شب کے افسانے چشمِ یار سے پوچھو
رات اِک کہانی ہے کچھ قمر جمالوں کی

انتظار کے لمحے جام ہیں تصوّر کے
خالی ہوتی جاتی ہیں بوتلیں خیالوں کی

فلم ہو کہ صنعت ہو شعر ہو کہ نغمہ ہو
ہر طرف خوشامد ہے چند حُسن والوں کی

ہے نشورؔ دُنیا میں اہلِ فن کی پامالی
کون بات پوچھے ہے ہم سے خستہ حالوں کی

۲۳۶

مرے کلام کو دانش کی اِک سحر سمجھو
نئی کرن پہ جھجکتی ہوئی نظر سمجھو

میں آنے والے تغیّر کی چاپ سُنتا ہوں
زمانے والوں کو دُنیا سے بے خبر سمجھو

تمھارے ساتھ چلے گا ہر ایک دورِ حیات
سفر ہے شرط زمانے کو ہم سفر سمجھو

ہر اِک نگاہ میں کالم ہیں چند خبروں کے
کہے یہ کون پیامِ دِل و نظر سمجھو

حیات دورِ عوامی کی خود نگہباں ہے
بہت طویل کہانی کو مختصر سمجھو

﴿۲۳۷﴾

غزل برطرحِ اقبالؔ

مجوّزہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

اس قدر زخمی ہے کچھ روحِ نگارِ حیات
سسکیاں بھرتا ہے دن کروٹیں لیتی ہے رات

قافلۂ عقل کو راستا ملتا نہیں
کاہکشاں کے قریب رُک گئی چلتی برات

رہ گزارِ وقت پر نقشِ قدم بے شمار
جیسے مسافر ہے دن ، ویسے مسافر ہے رات

ذائقۂ زہرِ غم مۓ میں تھا شامل مگر
بھولتی جاتی ہے زیست تلخیِ جامِ حیات

رکھ نہ سکا میں کبھی نام خزاں کا بہار
کہہ نہ سکا میں کبھی مصلحتاً دن کو رات

ہر چمن رنگ و بو تشنہ بیانِ رموز
ہر کلی گلزار کی ایک ادھوری سی بات

نغمہ و رقص و سرود میری تجلّی کا نام
عکس سے میرے حَسیں آئینۂ شش جہات

میرے سوا کچھ نہیں لفظ و بیاں میں نشورؔ
شعر کے ملبوس میں جلوہ فگن میری ذات

اِک وحشت دِل اِک حیرتِ غم
کیا ہوگیا ہے واللہ اعلم

ہر چیدہ گیسو اُن کا سراپا
شامِ مقیّد صبحِ مجسّم

وہ دیکھتے ہیں کس کس ادا سے
آئینہ رکھ کر اپنا ہی عالم

رحمت سے اس کی نزدیک ہوجا
دامن بھگولے اے چشمِ پُرنم

آہٹ سی آئی ان کے قدم کی
اے غم ذرا رُک اے دِل ذرا تھم

فرصت ہے کس کو جو سننے آئے
شعرِ نشورؔ اور افسانۂ غم

مرے غم کی کسک کچھ قلبِ شب میں پائی جاتی ہے
غزل میری ستاروں کے چمن میں گائی جاتی ہے

ہے تہذیبوں کا کچھ ایسا تصادم عصرِ حاضر میں
کہ جیسے روشنی سے روشنی ٹکرائی جاتی ہے

نہ عزمِ کوششِ پیہم نہ ذوقِ شعلہ و شبنم
یہ جینا کیا ہے اِک جینے کی عادت پائی جاتی ہے

سرک کر آ گئیں زُلفیں جو ان مخمور آنکھوں تک
میں یہ سمجھا کہ مے خانے پہ بدلی چھائی جاتی ہے

محفلیں سونی سی ہیں ہم بے قراروں کے بغیر
شاخِ گل افسردہ مِلتی ہے بہاروں کے بغیر

بے نیازِ اشکِ غم مِلتا نہیں احساسِ غم
کہکشاں کا کیا تصوّر ہے ستاروں کے بغیر

بادہ و پیمانہ ہم سے ہے ہمیں مے خانہ ہیں
ایک ساقی کیا کرے گا مے گساروں کے بغیر

ہر کمالِ زندگی کو اِک نمونہ چاہئے
ہے ادب بے مایہ میرے شاہ کاروں کے بغیر

ساحلوں سے دُور ہوکر موجِ دریا کیا نشورؔ
شاعری مبہم ہے موزوں استعاروں کے بغیر

ہم اپنی کہانی کے علامات نہ سمجھے
انسان ہی تنہا ہے یہی بات نہ سمجھے

دُنیا سحر و شام کی بستی سی ہے لیکن
ایسی بھی گھڑی آئی کہ دن رات نہ سمجھے

سو بار مِلے اُن سے بہ اندازِ دگر ہم
اور وہ ہیں کہ تقریبِ ملاقات نہ سمجھے

ہر نالہ ہے بے کار تو ہر شکوہ ہے بے سود
معشوق وہی ہے جو کوئی بات نہ سمجھے

﴿۲۴۲﴾

غم نے تیرے شبِ غم دِل کو سنبھلنے نہ دیا
اشکِ سوزاں نے چراغوں کو بھی جلنے نہ دیا

میرے مے خانے کی ہر شام جواں ہے اے دوست
رات کو موجِ مئے ناب نے ڈھلنے نہ دیا

خوں کی تحریر میں فتنوں کے قلم ٹوٹ گئے
حادثوں نے نئی دُنیا کو سنبھلنے نہ دیا

ایک ہی سحر تھا اس زُلفِ سیہ کا جس نے
اور جادو کوئی اس دَور میں چلنے نہ دیا

ہر گلی جھانکتے چلیے کہ مشیّت نے کبھی
ایک رستے پہ کسی شخص کو چلنے نہ دیا

﴿۲۴۳﴾

قسمتِ زندگی کو روئے ہوئے
ایک قطرہ میں غم سموئے ہوئے

صبح دم قاتلوں کو دیکھیے گا
خون سڑکوں سے شب کا دھوئے ہوئے

شہر اِک پاگلوں کی بستی ہے
جس کو دیکھو وہ ہوش کھوئے ہوئے

ہم اُگیں گے ہوائے ہند کے ساتھ
ہم ہیں اس سر زمیں میں بوئے ہوئے

شعر کہتے رہے ضرور نشورؔ
غم میں اپنے مگر تھے کھوئے ہوئے

پھول بھی توڑ چکے روند چکے کلیوں کو
آنے والی نئی صبحوں کو کچلتے نہ بنے

جس طرف دیکھیے کانٹوں کی بچھی ہے چادر
صحنِ گلشن میں ہواؤں سے بھی چلتے نہ بنے

ہم نوا شہرِ نگاراں ہو کہ بزمِ اقوام
عشق میں کوئے ملامت سے نکلتے نہ بنے

وقت سے پہلے بدل جاؤ تو اچھا ہے نشورؔ
غم کے طوفانوں میں انساں سے سنبھلتے نہ بنے

سمجھے گی دُنیا بعد از زمانہ
دِل اِک حقیقت ، باقی فسانہ

شامِ جوانی ، کوچہ بہ کوچہ
زُلفوں کی راتیں شانہ بشانہ

کس مے کدہ میں جاگے ہو شب بھر
پلکیں گلابی ، آنکھیں شبانہ

بادہ و پیمانہ ہے مملکتِ خشک و تر
شیشے میں ارض و سما جام میں شام و سحر

غم بھی بھٹکتا رہا دل بھی دھڑکتا رہا
زندگی ٹھہرے کہاں زیست سفر ہی سفر

ان کا تکلّم حَسیں ہاں کہیں وہ یا نہیں
بات تو کچھ بھی نہ تھی یاد رہی عمر بھر

شکوہ و لطف و عتاب دِل سے سوال و جواب
قافلے غم کے گئے رہ گئی اک چشمِ تر

مجرمِ شہرِ شعور ایک جنابِ نشوؔر
پوچھے ہے کس کو بلا، ہے یہی شاعر کا گھر

متفرق

کوئی دامن میں پھر گلہائے اُردو لے کے آیا ہے
دکن سے جو بھی آیا ہے وہ خوشبو لے کے آیا ہے

ہزاروں خواب سوتے جاگتے ہیں اُن کی آنکھوں میں
ہجومِ مہوشاں ہے شامِ گیسو لے کے آیا ہے

نشوؔر اربابِ دُنیا کی شکایت کیا کہ ہر شاعر
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو لے کے آیا ہے

۲۴۸

سماج کا ایک رُخ

اِک دُنیا کاغذ کی بھی ہے، فرمان ہیں اور تحریریں ہیں
اِک مجلس لفظوں کی بھی ہے، بے معنی سی تقریریں ہیں

اِک گوشہ رندوں کا بھی ہے، ساقی، صہبا، پیمانوں کا
اِک حلقہ مذہب کا بھی ہے، نفرت سے بھری تکفیریں ہیں

باطل کی کئی دُنیائیں ہیں، ظاہر کے پرت باطن کی تہیں
بے لفظ کی کتنی نظمیں ہیں، بے آیت کی تفسیریں ہیں

یہ محفل شعر وسخن کی ہے یا حزبِ مخالف کا دفتر
نعروں کے سہارے چلتی ہوئی منظوم سی کچھ تقریریں ہیں

تصویر میں اپنی رنگ ہمیں بھرتے ہیں نشورؔ افسانوں کا
دُنیا کی حقیقت کچھ بھی نہیں، کچھ خواب ہیں کچھ تعبیریں ہیں

متفرق

ایک رات آتی ہے ایک رات جاتی ہے
گیسوؤں کے سائے میں کس کو نیند آتی ہے

ہاتھ رکھتی جاتی ہے یاس دِل کے داغوں پر
میں دِیا جلاتا ہوں وہ دِیا بُجھاتی ہے

نام پڑ گیا اس کا کوچۂ حرم لیکن
یہ گلی بھی اے زاہد مے کدے کو جاتی ہے

مکمل غزل اشک چکاں سے عصرِ رواں میں شامل ہے۔

حرفِ مستی بہ وداعِ لب بیگانہ سہی
بادہ گل ریز ہے پیمانہ بہ پیمانہ سہی

حاصلِ مے کدۂ عشق ہے آگاہ روی
ہوش کے راز کا محرم ہو تو دیوانہ سہی

ہے پسِ پردۂ آلام اُمیدوں کی جھلک
کچھ تو ہے میرے تخیّل کا صنم خانہ سہی

کوئی ساماں نہیں ایسا کہ مژہ ہو برہم
رات کا وقت ہے بھولا ہوا افسانہ سہی

موجِ صہبا سے بھی افکار سنورتے ہیں نشورؔ
آدمی آدمی ہو مشربِ رندانہ سہی

حُسن کی تنہائی

آئینہ ہے اور تنہائیاں ہیں
شانہ بہ شانہ رعنائیاں ہیں

پہلو بدلتے ہیں وہ ادا سے
ٹوٹی ہوئی سی انگڑائیاں ہیں

مہکی ہوئی سی شامِ الم ہے
گیسو بہ گیسو تنہائیاں ہیں

﴿۲۵۱﴾

بہاریں ہیں تو پھر گلشن کھلیں گے
زوالِ رنگ و بو بھی کچھ نہیں ہے

گلاب و عطر ہے ان کا پسینہ
مگر میرا لہو بھی کچھ نہیں ہے

نہ آنسو ہیں نہ صہبائے کہن ہے
ترا زاہد وضو بھی کچھ نہیں ہے

ہمیں دُشمن نشورؔ اپنے ہیں ورنہ
عدو کیا ہے عدو بھی کچھ نہیں ہے

﴿۲۵۲﴾

رات کے گیسو کمر تک آئے ہیں
پھر ستارے چشمِ تر تک آئے ہیں

جانے اِک ساغر میں کتنے خواب تھے
نیند کے جھونکے سحر تک آئے ہیں

اِک نگاہِ مختصر سے ہم نشورؔ
اِک بیانِ مختصر تک آئے ہیں

انتظارِ صبح میں ساقی نہ رکھ خالی یہ جام
کون جانے مے کدہ کی صبح بہتر ہے کہ شام

صبح کی تکمیل کرنا چاہتا ہے رنگِ شام
زندگی حُسنِ تمام و ہر تجلّی ناتمام

کعبہ والے جب مِلے انکارِ حسنِ عمل
تازہ پیغامِ خدا آیا صنم خانوں کے نام

شعر بے سرمایۂ دُنیا ہے بے معنی نشورؔ
شاعرانِ محترم بھی آج ہیں بے احترام

یوں ہی قسمت کا یہ افسانہ رہے گا کچھ دن
خالی خالی مرا پیمانہ رہے گا کچھ دن

جس کو کہتے ہیں خدا حسنِ بتاں تھا پہلے
کعبہ کوئی ہو صنم خانہ رہے گا کچھ دن

جام ہے بادہ نہیں، بادہ ہے اور جام نہیں
رنج بے ربطیِ مے خانہ رہے گا کچھ دن

بزمِ تحقیق مقالات میں اُردو کا ادیب
ہر بُجھی شمع کا پروانہ رہے گا کچھ دن

یہ گزرتی ہوئی شب یاد رہے گی ان کو
رات کا سایہ پسِ شانہ رہے گا کچھ دن

زخم خوردہ ہے محبت کا جو بے چارہ نشورؔ
ہوش میں آ کے بھی دیوانہ رہے گا کچھ دن

اعتمادِ دوست ہے دُشمن مِرا
پوچھتے ہیں سب مِرے قاتل کا نام

ان حجابوں میں کوئی دِل بر نہیں
چل رہا ہے کچھ دنوں محمل کا نام

عشق اپنی ذات کا گہرا شعور
عاقل اپنی ذات سے غافل کا نام

چاند تارے نقش پائے بے حِسی
آدمی احساس کی منزل کا نام

حال بھی ہے شیشۂ خالی نشورؔ
جی رہا ہوں سُن کے مستقبل کا نام

ہم بھی ہیں ان جرأت ایجادوں کے بعد
حافظ و سرمدؔ سے آزادوں کے بعد

عشق ہے جلتے دِلوں کا کارواں
کچھ نہ یاد آیا تری یادوں کے بعد

پھولتی پھلتی ہے تاریخِ جنوں
نغمہ برلب ہوں میں فریادوں کے بعد

اِک مسلسل بے وفائی ہے حیات
شاد ہے غم کتنے ناشادوں کے بعد

روحِ مستقبل ہوں میں شاید نشورؔ
مَیں غزل پڑھتا ہوں اُستادوں کے بعد

تنہا نہیں ہوں وقت کی تنہا روی میں بھی
بادِ صبا کا ساتھ ہے آوارگی میں بھی

کیا دیکھتا ہے خندۂ گلہائے بے ثبات
خونِ جگر کا رنگ ہے اپنی ہنسی میں بھی

کتنے حسین آئینہ تک جا کے کھو گئے
دِل کا معاوضہ نہ مِلا دِل برَی میں بھی

کچھ اس قدر جہاں میں مصائب کا تھا ہجوم
میں زندگی سے مِل نہ سکا زندگی میں بھی

لرزشِ غم میں سکونِ دِل کہاں
جو اُٹھا طوفاں تو پھر ساحل کہاں

اشکِ خوں آ کر مژہ پر رُک گیا
دِل ٹھہرتا ہے مگر منزل کہاں

قتل گہہ میں ڈھونڈھتا ہے تو کسے
ہاتھ میں تلوار ہے قاتل کہاں

وقت اسیرِ گیسو و رُخ کب رہا
غم میں صبح و شام کی منزل کہاں

دعوتِ عیش زمانہ اور نشورؔ
شاعرِ غم دیدہ اس قابل کہاں

تری رگوں کا لہو بھی چمن کے کام آئے
چراغ وہ کہ جَلے انجمن کے کام آئے

کسی مژہ سے ٹپکنا بھی کام ہے لیکن
لہو وہی ہے جو ارضِ وطن کے کام آئے

کلی نے پھیر لیا مسکرا کے منہ لیکن
یہی پڑے ہوئے کانٹے چمن کے کام آئے

رہِ وفا میں تو سب کچھ لُٹا دیا ہم نے
یہاں تو وہ بھی نہیں جو کفن کے کام آئے

اب ایسی تیز ہوا کا ہے انتظار نشورؔ
جو لالہ و گل و سرو و سمن کے کام آئے

اے گوشہ نشینانِ زیارت گہہِ تہذیب
نکلو کہ یہاں فصلِ جنوں اب بھی کھڑی ہے

ہر لحظہ یہاں ٹلتے ہیں اعمالِ شب و روز
ہر لمحہ یہاں جیسے قیامت کی گھڑی ہے

شاعر ہے نشورؔ آج زمانے کا پیمبر
خاموش کہ اس دَور میں یہ بات بڑی ہے

مکمل غزل اشک چکاں سے عصرِ رواں میں شامل ہے

اشکِ چکاں

سے

عصرِ رواں

تک

(غیر مطبوعہ غزلوں کا مجموعہ)

نوٹ: اِس مجموعہ میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۸۲ء تک کی وہ غزلیں شامل ہیں جو نشورؔ واحدی صاحب کے کسی بھی شعری مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اِن غزلوں کے نیچے تاریخ بھی درج ہے تا کہ غزلوں کے کہے جانے کے اَدوار کا پتہ چل سکے۔

کلیاتِ نشورؔ واحدی حصہ غزلیات

۱۹۴۲ء

سے

۱۹۸۲ء

تک

۲۶۰

معاشرہ

محورِ حُسن و نزاکت ہے سَماج
زِندگی ہے ایک شاعر کا مزاج

سنگ و آہن وقت کے خوش پوش لوگ
توڑ دیں انسانیت کا ہر زجاج

رُوح کی پاکیزگی مذہب کی جان
دین اِک سچّی رواداری کا تاج

کارِ مفتی عالمی وحدت کی فِکر
بینُ الاقوامی رَوِش پر اِحتجاج

کارِ سَرمایہ مُہذّب رَہزنی
جنّتِ اَرضی میں ہے اُن کا ہی رَاج

ہر مورّخ فطرتِ نفرتؔ پسند
دَفترِ پارینہ اُن کا اِندراج

بہرِ شاعر نَارَوا اِعزازِ وَقت
بہرِ ناداں کُرسی و دَیہیم و تاج

شِکوَہ برَ لَبْ کیوں نظر آئے نشورؔ
چُپ ہے یاں ہر شاعرِ نازک مزاج

۱۸؍دسمبر ۱۹۸۲ء

(۲۶۱)

لالہ و گل کے تخیّل سے لہکتی جائے ہے
اِک ہوا ہے شاعری بھی جو سنکتی جائے ہے

ہے مرے اَنفاس سے یہ زِندگی کا جَزر و مَدّ
دِل دھڑکتا ہے تو دھرتی بھی دھڑکتی جائے ہے

صبح کو اُن کے خرامِ ناز کا عالم نہ پوچھ
شاخِ گل ہے صحنِ گلشن میں لچکتی جائے ہے

اِک جھلک دیکھی تھی دامانِ خیالِ یار کی
دُور تک بجلی تصوّر میں چمکتی جائے ہے

میرے آنسو بن گئے اوراقِ مَاضی کے نُقوش
زِندگی تاریخ کے پیچھے سرکتی جائے ہے

سرحدِ انسانیت سے دُور ہے ہر کارواں
راہبر کوئی نہیں دُنیا بھٹکتی جائے ہے

تیرے نَالے بے اَثر، اُن کا تبسُّم دِلخراش
ایک تھی آواز اُردو کی وہ تھکتی جائے ہے

ان[1] عَوامی شاعروں کی دَاستانِ غَم نشوؔر
اب تو آنکھوں سے لہو بن کر ٹپکتی جائے ہے

یکم اپریل ۱۹۸۲ء (آج کل دہلی)

---

[1] کہیں کہیں ''ہم'' بھی لکھا ہے۔

۲۶۲

نہ تو دَرد بڑھا نہ تو اَشک چلے
کہیں شام ہوئی تو چراغ جلے

تری یادِ حَسیں، مرے دل کے قریں
کہیں جیسے نسیمِ بہار چلے

کوئی جنگ ہے اپنی حقیقتِ غم
نہ تو موت ٹلے، نہ حیات ٹلے

ترا آئینہ خود ہی سیاہ نہ ہو
کہ زمانہ میں ہم ہیں بُرے نہ بھلے

سرِ بزم ضِیا ہے سبھی کے لیے
اب اندھیرا نہیں ہے چراغ تلے

کوئی غم ہو نشورؔ تو آہ نہ کر
کوئی دِل نہ دُکھے کوئی دِل نہ جلے

۲۵؍فروری ۱۹۸۲ء

۲۶۳

ہر لمحہ آگہہ، ہر لمحہ حیراں
دِل کی حقیقت، آئینہ ساماں

اُن کی نظر ہو یا طبعِ شاعر
یہ بھی غزل خواں، وہ بھی غزل خواں

پُھلواریوں سے حرص و ہوس کی
گزرا ہوں میں بھی برچیدہ داماں

رَمزِ محبت، دِل کش تبسّم
کوئے سیاست گیسوئے پیچاں

بے اعتمادی کا ہے یہ عالم
دہشت زدہ ہے اِنساں سے اِنساں

یہ حُسنِ رنگیں، یہ عشقِ غمگیں
دونوں حقیقت دونوں رگِ جاں

شعرِ نشورؔ اور سُونی یہ محفل
آئی کہاں سے شامِ غریباں

۲۴؍مارچ ۱۹۸۱ء

﴿۲۶۴﴾

کہتا ہے زمانے کا تیور، کچھ دُور رہو مہ پاروں سے
کیوں کھیلے کوئی انگاروں سے، کیوں پھول چنے رخساروں سے

خاموش نہیں ہے کوئی خبر، بجتی ہے نسیمِ شام و سحر
ہے کچھ تو حریمِ جاناں میں، اندازہ ہُوا جھنکاروں سے

شیشہ ہو کہ ساغر اے ہمدم ناواقفِ دردِ سنگِ اَلم
ٹوٹا ہوا دِل مِلتا ہی نہیں، میں لوٹ چلا بازاروں سے

ویران بھی ہے رنگین بھی ہے، دُنیا بھی عجب اِک رستہ ہے
یاں چوٹ لگی ہے پھولوں سے یا زخم بھرے ہیں خاروں سے

اُردو کی کہانی بھی دِلکش، بے باک سی ہے کچھ یہ مہوش
اس طرح چلی دَرباروں سے ٹکرا ہی گئی سرکاروں سے

ہے شعرِ نشورؔ، اِک سازِ الم، رنگیں رنگیں اِک نغمۂ غم
کیوں شبنمِ گُل میں ڈوب گیا ٹپکا تھا لہو جو تاروں سے

۲۰؍فروری ۱۹۸۱ء لکھنؤ ریڈیو کے لیے

مُعطّر اتنی ہے کس کے اثر سے پوچھ تو لو
کہاں سے آتی ہے بادِ سحر سے پوچھ تو لو

نہ دُھوپ ہے نہ کہیں چھاؤں ہے چراغ تلے
فریبِ نور ہے شمس و قمر سے پوچھ تو لو

یہاں نہیں کوئی تقسیم دِل کی دُنیا میں
حیات کیا ہے یہ رُوحِ بشر سے پوچھ تو لو

نہ کوئی دَور ہے ماضی نہ کوئی مستقبل
زمانہ ایک ہے شام و سحر سے پوچھ تو لو

ہے بیچ رَاہ میں اِنسانیت بھٹکتی ہوئی
قدم کہاں ہے کسی ہم سفر سے پوچھ تو لو

حَسین نظم میں بھی شعریت نہیں ہے نشورؔ
یہ فنِ شعر ہے اہلِ نظر سے پوچھ تو لو

مشاعرہ قومی یک جہتی مورخہ ۲۴؍نومبر ۱۹۸۰ء لکھنؤ

کی عطا ماضی نے وہ آئینہ سامانی مجھے
ہر جگہ بکھری ملی تصویرِ اِنسانی مجھے

ساقیا پھر ایک جامِ نَو بہ صہبائے کہن
پھر بدلنا ہے خمیرِ عالمِ فانی مجھے

نالہ نغمہ ہوگیا میری زباں کے فیض سے
حُسنِ فطرت نے عطا کی وہ گُل اَفشانی مجھے

کون پوچھے کار سازِ پردۂ اسرار سے
شوق باقی ہے تو کیوں دی زندگی فانی مجھے

اِس سفر میں ہر مسافر کی ہے منزل بھی الگ
مَیں جہاں ٹھہرا ملی ہے سطحِ اِنسانی مجھے

اِک تبسُّم ہے کلی کا، اپنی ہستی کا شعور
زندگی ہے ایک دَرسِ تنگ دَامانی مجھے

اِک نگاہِ شوق سے روشن ہوا اسرارِ زیست
جیسے سب معلوم تھا رازِ جہاں بانی مجھے

خود بخود کھلنے لگے دانائی نوَ کے فریب
جلد ہی ہونے لگا احساسِ نادانی مجھے

فِکر میں وسعت ہو اور گہرا ہو کچھ رنگِ غزل
جانتے ہیں سب نشورؔ اِس طرز کا بانی مجھے

۵رفروری ۱۹۸۰ء ریڈیو لکھنؤ برائے گورکھپور

۲۶۷

دِل فگاروں پہ سِتم ہو یہ چلن آج بھی ہے
دُور تک سلسلۂ دار و رَسن آج بھی ہے

اب بھی بے نور ہیں ایوانِ محبت کے چراغ
رنگ در رنگ جراحت کا چمن آج بھی ہے

اُنھیں ذرّوں سے دھڑکتے ہوئے دِل اُٹھیں گے
ہلکی ہلکی یہ اُمیدوں کی کرن آج بھی ہے

چونکتے سب ہیں مگر چونک کے سو جاتے ہیں
محفلِ کہنہ میں کچھ تازہ سخن آج بھی ہے

ایک لغزش کی کئی بار سزا مل کے رہی
سود در سود زمانے کا چلن آج بھی ہے

کِس نے پہچانا ہے، اے دوست زمانے کا مِزاج
وقت کے مَاتھے پہ تھوڑی سی شکن آج بھی ہے

آدمی وہ نہیں، اَب شہر کی گلیوں میں نشورؔ
منظرِ صبحِ وطن شامِ وطن آج بھی ہے

۵/اکتوبر ۱۹۷۹ء۔ نیا دور لکھنؤ

﴿۲۶۸﴾

کوئی جلوہ ہو کوئی شعلہ ہو کوئی بات ہو تو بتایئے
ابھی شام اوّلِ شام ہے ذری رات ہو تو بتایئے

کوئی دھوم دَھام یہاں نہیں غم و دَرد عام یہاں نہیں
کسی شہرِ علم و کمال میں یہ برات ہو تو بتایئے

یہ سفالِ میکدہ چھوڑ دوں، یہ پیالہ پھینک کے توڑ دوں
مگر ان کی نیچی نگاہ میں، یہ حیات ہو تو بتایئے

وہی کامیابِ جنوں رہا، جو دلِ شکستہ میں جا بسا
جو دِل اپنا ہار گیا کہیں، اُسے مات ہو تو بتایئے

یہ مسیحِ وقت جو آئے یاں، وہ مرض بڑھا گئے بیکراں
یہ طویل وعدہ نجات کا، جو نجات ہو تو بتایئے

جو سَماج آج ہے کل نہ تھا، جو مِزاج کل تھا وہ اب نہیں
کسی اِک نظامِ حیات کو، جو ثبات ہو تو بتایئے

وہ دِلوں کے گوشے نہیں رہے، جہاں تھی نشورؔ کی اِک جگہ
کسی اور شہر نکل چلیں، ابھی رات ہو تو بتایئے

ٹی وی مشاعرہ لکھنؤ ۲۹؍جون ۱۹۷۹ء

﴿۲۶۹﴾

اِس طرح غم کا اِکرام مشکل
ہر صبح مشکل ، ہر شام مشکل

اوّل قدم سے آخر قدم تک
راہِ طلب کا اِتمام مشکل

بے لذّتِ غم بے جہدِ پیہم
آرام میں بھی آرام مشکل

مرنا بھی آساں ، جینا بھی آساں
ہمّت نہ ہو تو ہر کام مشکل

یہ خارِ صحرا ، ہم پا برہنہ
ہر گام رنگیں، ہر گام مشکل

پھولوں کو مجرم کہنا ہے آساں
موجِ صَبا پر الزام مشکل

ہر بات انوکھی ، ہر بات ادھوری
طرزِ سخن کا اتمام مشکل

برائے ٹی وی۔لکھنؤ ۸؍جون ۱۹۷۹ء

﴿۲۷۰﴾

یہ فضائے نالۂ غم یہ فغانِ ناتوانی
سبھی سن رہے ہیں اے دل ، نئے دَور کی کہانی

کوئی سانس لے تو کیسے کہ فضا ہی دِل شکن ہے
نہ وہ شام ہی منوّر، نہ وہ رات ہی سہانی

میرے دوستوں نہ پوچھو نئ نسل کی کہانی
جو جگائے بھی نہ جاگے وہی نیند ہے جوانی
ترا اعتبار کیا ہو تیرا انتظار کیا ہو
ترے وعدے اِک کہانی ترا حسن حسنِ فانی
کوئی سانس لے نہ کیسے یہ فضائے سن و آہن
کہ قدم قدم تھکاوٹ کہ نفس نفس گرانی
مرا غم خمار رنگیں تری نیند موجِ صہبا
تری رات بھی نشیلی میری شام بھی سہانی
یہ فضائے گوشہ گل کوئی چیخ کر تو دیکھے
نئے دور کیسے سمجھیں یہ زبان بے زبانی
یہ ہجوم لفظ و معنی ہے نشوؔر اِک اشارہ
ہے کلی بھی ادھ کھلی سی مری تازہ گل فشانی

کہیں برقِ آہِ سوزاں، کہیں اشکِ چشم باراں
کہیں ٹھیر جا مسافر کہ برس رہا ہے پانی

سفرِ حیات مبہم، ہے عبورِ سنگ و آہن
کہ قدم قدم تھکاوٹ کہ نَفَس نَفَس گرانی

کہیں اِک نفَس کی قیمت ہے ہزار زخم کاری
کہیں مفت بٹ رہی ہے یہ متاعِ زندگانی

وہیں دُور ہوسکے گی غم و دَرد کی گرانی
کسی میکدہ میں چلئے جو بچی ہو عمرِ فانی

یہ ہجوم لفظ و معنیٰ، ہے نشورؔ اِک اِشارہ
جسے کہئے فکرِ شاعر، ہے زبان بے زبانی

برائے ٹی وی لکھنؤ ۲۴؍اپریل ۱۹۷۹ء

﴿۲۷۱﴾

وفا ہو یا جفا ہو حسرت بالیدہ ہے وہ بھی
محبت جس کو کہتے ہیں گلِ ناچیدہ ہے وہ بھی

حَسین[1] تر حوصلے رکھتا ہے اِک محبوب کا پیکر
ادائے بے نیازی ہے مگر غم دیدہ ہے وہ بھی

کسی کو نیند[2] آ سکتی ہے کیا بزم تہتّک میں
جسے کہئے زمانہ دردِ ناخوابیدہ ہے وہ بھی

نظر پھیرے ہوئے مِلتا ہے رستے کا ہر اِک ساتھی
جسے ہم دوست سمجھے تھے نظر دُزدیدہ ہے وہ بھی

خود اپنے فیصلے لپٹے ملیں گے اپنے ہاتھوں میں
سیاست جس کو کہتے ہیں بخود پیچیدہ ہے وہ بھی

غزل میں مائلِ فریاد ہے جیسے کوئی نغمہ
نشورؔ اس کو کہے ہیں شاعرِ غم دیدہ ہے وہ بھی

۴؍جولائی ۱۹۷۷ء

۱؎ ماہنامہ نیا دَور میں لکھنؤ میں یہ مصرع یوں شائع ہوا تھا۔ ’’شکست دلبری ہے شاید اِک محبوب کا پیکر‘‘
۲؎ ماہنامہ نیا دَور میں یہ مصرع یوں شائع ہوا تھا۔ ’’کسی کو نیند آ سکتی ہے اس بزمِ تہتّک میں‘‘

ہر اِک چہرے سے بے ربطی عیاں ہے
مُحبّت ہے مگر جانے کہاں ہے

ترے کانوں میں آتے ہیں جو الفاظ
وہ بے معنی سی کوئی داستاں ہے

یہ ہستی ہے مُسَلسَل خواب لیکن
ہر اِک لمحہ حیاتِ جاوداں ہے

کوئی شیدا نہیں حُسنِ بُتاں کا
بظاہر اِک ہجومِ عاشقاں ہے

ہمیں تم ہیں رموزِ بزمِ ہستی
زمانہ ایک اندازِ بیاں ہے

نشورؔ اپنی غزل سے روشنی لے
کہ شاعر بھی چراغِ گل فشاں ہے

سوینئر جشنِ نشورؔ کان پور۔۳؍جون ۱۹۷۸ء

مستقبلِ عالم کی انساں کو خبر کیا ہے
آئینے کا پرَتو ہے کیا جانے اُدھر کیا ہے

دانش کے سبھی رستے ویران ہیں صدیوں سے
جس پر نہ چلے کوئی وہ راہ گزر کیا ہے

منزل بھی گریزاں ہے رستے بھی سفر میں ہیں
دھوکا ہے سفر کا یہ احساسِ سفر کیا ہے

دانائی کے پردے میں روپوش ہے نادانی
ہم کو ہے خبر لیکن ہم کو بھی خبر کیا ہے

اِک خوابِ محبت میں سو خواب ہیں قسمت کے
ہے رات کا اِک حصّہ شاعر کی سحر کیا ہے

۲۹؍دسمبر ۱۹۷۸ء

﴿۲۷۴﴾

ساقی کی بیگانہ روش پر کیا الزام لگایا جائے
ہستی اِک ایسا پیمانہ بھرتے جاؤ چھلکتا جائے

دُنیا میں اصرارِ گنہ بھی، ایک ادائے مجبوری
توبہ[۱] توبہ ہوتی جائے اور دامن دامن بھیگا جائے

کتنے بادل بکھر گئے اور کتنی برکھا سوکھ گئی
دُنیا ہے وہ ریت کا رستہ، ساون بھادوں پیاسا جائے

آنسو نے کچھ کام کیا، اب بارِ الم بھی ہلکا ہے
غم کا لمحہ بھی اِک بادل کھُلتا جائے برستا جائے

حسرت وغم ہو، آرزوئیں ہوں کوئی محوِ خواب نہیں
دِل سینے میں وہ انگارہ بُجھتا جائے دہکتا جائے

۱ پہلے مصرع اس طرح تھا: ''جیسے دامن بھیگا جائے جیسے آنسو ٹپکا جائے''

عشق ربودہ کی وہی صورت، جیسے نشہ میں نیند ملے
حسنِ غنودہ کا وہی عالم، جیسے مہوا ٹپکا جائے

مرگ بھی تنہا زیست بھی تنہا، راہ کا ساتھی کوئی نہیں
راہ کٹیلی، رات اکیلی، عشق ہی سوتا جگتا جائے

آؤ نشورؔ سے پوچھیں چل کر، کیسی ہے یہ گرم ہوا
پتھر پتھر ٹوٹ رہا ہے شیشہ سہا جائے

۳۱/مارچ ۱۹۷۷ء ریڈیو لکھنؤ

ہر قرار و ثبات گزرے ہے
تیز قدموں حیات گزرے ہے

ہر گلی سے ہوائے زُلفِ بُتاں
باہمہ عطریات گزرے ہے

کیوں کریں کوئی بد شگونی ہم
زندگی کی برات گزرے ہے

ہر سماج اپنے ذوق کے ساتھ
مَاورائے جہات گزرے ہے

یوں گزرتی ہے زندگی اپنی
جیسے رونے میں رات گزرے ہے

۲۱/مارچ ۱۹۷۷ء

لبوں پر گردِ ترنُّم کبھی جمی بھی نہیں
مرے سخن میں کسی بات کی کمی بھی نہیں

فلک کو چھوڑ کے اب آ رہا زمیں پہ غبار
اُٹھی جو گردِ الم آج تک تھمی بھی نہیں

کچھ اور مانگ خدا سے کہ زندگی ہے وبال
حیات کی تری دُنیا میں کچھ کمی بھی نہیں

غمِ جہاں کا غموں میں شُمار ہی کب تھا
وہ غم بھی کیا جو بہ اندازِ بے غمی بھی نہیں

ہر ایک فرد ہے حیوان خوش لباس نشورؔ
ہم آدمی ہیں پہ در اصل آدمی بھی نہیں

۲۵/جنوری ۱۹۷۵ء

۲۷۷

اُنھیں دیکھ کر ہم کہاں تک سنبھلتے
ہمیں سوگئے کچھ دِیا جلتے جلتے

ہماری نگاہوں تلک آ گئے وہ
غزل کی طرح کتنے سانچوں میں ڈھلکے

کبھی قیدِ مغرب ، کبھی قیدِ مشرق
جو آزاد ہوتے قفس کیوں بدلتے

ہواؤں کی رفتار ہے تیز اتنی
چمن بچ گیا ہے کچلتے کچلتے

سنہری سی زُلفوں کا بہتا سا سونا
تمھیں دیکھ لو بادلوں کو پگھلتے

قدم رکھتے ہی منزلوں نے پکارا
پہنچ ہی گئے ہم بھی گرتے سنبھلتے

نشورؔ آج ہم ہیں اندھیروں کے مہماں
جو شاعر نہ ہوتے تو کرنوں پہ چلتے

۱۱؍جون ۱۹۷۳ء

﴿۲۷۸﴾

پلکوں کے نرم سائے میں پلنا ہے آپ کو
اور زِندگی کی دُھوپ میں چلنا ہے آپ کو

صَہبا کہاں ملے گی، تعیّن نہیں کوئی
کچھ دُور خالی جام بھی چلنا ہے آپ کو

اندازِ اِلتفات کے ساغر کو چُوم کر
ساقی کا بھی مزاج بدلنا ہے آپ کو

تبدیلیوں کی آنچ میں تپ کر بہ فیضِ شوق
سانچے میں انقلاب کے ڈھلنا ہے آپ کو

ہے عاشقی کو مسلکِ پروانگی پہ فخر
جَلتے ہوئے چراغ پہ جَلنا ہے آپ کو

کرسی وزارتوں کی ہے چڑھتا ہوا نشہ
ایسے میں گرتے گرتے سنبھلنا ہے آپ کو

جدَّت پہ آپ کی مَیں نہیں معترض نشورؔ
کچھ شاعری کا رنگ بدلنا ہے آپ کو

۱۷؍مارچ ۱۹۷۳ء دہلی

﴿۲۷۹﴾

نام اُن کا زباں پر ابھی لائے نہ بنے ہے
افسانے کا عنوان بتائے نہ بنے ہے

اے شامِ اَلم تو ہی اُنھیں جا کے منالا
رُوٹھے ہیں وہ ایسے کہ مَنائے نہ بنے ہے

بے گانگیٔ ربطِ محبت کو نہ پوچھو
آئے جو بنے واں سے تو جائے نہ بنے ہے

جلدی سے کوئی پونچھ لے کس طرح سے آنسو
جلتے ہوئے دیپک کو بجھائے نہ بنے ہے

جب تک کوئی رنگین سی آواز نہ کھنکے
سوتی ہوئی راتوں کو جگائے نہ بنے ہے

کیا جانئے ان مست نگاہوں نے کیا کیا
ساغر بھی اُٹھاؤ تو اُٹھائے نہ بنے ہے

جاری ہے ترنُّم کا مِرے فیض بھی لیکن
اَندازِ سخن میرا اُڑائے نہ بنے ہے

تاباں ہے نشورؔ اپنا تخیّل تو کروں کیا
پردہ مَہ و انجم پہ گرائے نہ بنے ہے

۱۸ر فروری ۱۹۷۳ء

جا بجا ظلمتوں کا ڈیرہ ہے
بجھ گئی شمعِ غم اندھیرا ہے

عشق اِک کاروانِ آگاہی
حُسن اِک بے خبر لُٹیرا ہے

شہر کی خوش نصیب گلیوں میں
ہم سے بدقسمتوں کا پھیرا ہے

اِک زمانہ ہوا ہے روٹھے ہوئے
اب بھی آجایئے سویرا ہے

ایک لمحہ کی روشنی ہے نشورؔ
وقت اِک مستقل اندھیرا ہے

۲۳/نومبر ۱۹۷۲ء

لکھنؤ

یہ شہر باغ ہے حضرت محل کی یادوں کا
ہر ایک کوچہ ہے کِھلتا ہوا گلاب کوئی

نظر نواز ہے دِلّی کی چاندنی بھی مگر
اَودھ کی شَام کا مِلتا نہیں جواب کوئی

حَسیں تصوّرِ ماضی نقوشِ مستقبل
یہ لکھنؤ ہے کہ ہے گومتی کا خواب کوئی

۲۶/اگست ۱۹۷۲ء لکھنؤ

نظر کو مئے ارغوانی کہیں گے
ان آنکھوں کو بھولی کہانی کہیں گے

محبت کو بھی آنی جانی کہیں گے
جو رُوٹھے اُسی کو جوانی کہیں گے

تم آؤ تو پُورا فَسانہ سمجھ لیں
یہ شاعر اَدُھورِی کہانی کہیں گے

سِتاروں پہ بھی حکم چلتا رہے گا
محبت کو راتوں کی رانی کہیں گے

ہر اِک جرعہ میں خود کو ہم پی رہے ہیں
ہر اِک جام کو عمرِ فانی کہیں گے

۵؍مئی ۱۹۷۱ء برائے کلکتہ

جو طوفاں کے مَزے پائے ہوئے ہیں
وہ پھر ساحِل سے ٹکرائے ہوئے ہیں

ہر اِک تہذیب ہے ممنون میری
یہ گیسو میرے سلجھائے ہوئے ہیں

یقیں ہے جن کو الفاظِ حَسیں پر
وہ دھوکا آج بھی کھائے ہوئے ہیں

اندھیرے میں ہیں پروانے خرد کے
چراغوں کے تلے آئے ہوئے ہیں

بہاریں بجھ گئی ہیں اس چمن کی
یہ لمحے جیسے مرجھائے ہوئے ہیں

معطّر سی ہیں گلشن کی فضائیں
سنا ہے وہ یہاں آئے ہوئے ہیں

نشورؔ اِک دَور ہے منکر تو کیا غم
دماغوں پر ہمیں چھائے ہوئے ہیں

۴؍نومبر ۱۹۷۵ء بہ حالتِ علالت

﴿۲۸۴﴾

ہر نظر کو یہ تبسّم، یہ پیام آتے نہیں
کھلتی کلیوں کو یہ اندازِ کلام آتے نہیں

انتظارِ دوست بھی ہے چلتی سانسوں کا شمار
صبح وہ آتے نہیں، اور وقتِ شام آتے نہیں

سننے والوں نے سنا ہے یہ لبِ منصور سے
دار سے پہلے محبت کے سلام آتے نہیں

زُلف و رُخ کی یہ کہانی سنتے سنتے سو نہ جا
لوٹ کر یہ رہ نوردِ صبح و شام آتے نہیں

کون جانے وہ شہیدانِ محبت کون تھے
زیست کی محفل میں پروانوں کے نام آتے نہیں

میرے آنسو دِل شکن ، اُن کے تبسّم دل فریب
یہ بھی کام آتے نہیں اور وہ بھی کام آتے نہیں

رقصِ جامِ بادہ کیسا اور کہاں کا دورِ مے
ہاتھ سو جاتے ہیں، ہونٹوں تک یہ جام آتے نہیں

ہر نفس ٹھیرا ہوا ہوں اور سفر میں ہوں نشورؔ
ہر مسافر کو یہ اندازِ خرام آتے نہیں

۷؍جولائی ۱۹۷۰ء

﴿۲۸۵﴾

وہ عمر جو دُنیا میں بسر کرتے رہے ہیں
اِک لمحۂ ہستی میں سفر کرتے رہے ہیں

یہ حُسن بھی اِک آگ ہے اور عشق بھی اِک آگ
انگاروں میں شعلوں پہ نظر کرتے رہے ہیں

زُلفوں کی گھنی چھاؤں ہو یا دورِ مصائب
جو شام بھی آئی ہے سحر کرتے رہے ہیں

وہ ایک تبسّم میں چُھپا لے گئے سب کچھ
نالے مرے اُن پر بھی اثر کرتے رہے ہیں

ہم نے بھی نگاہوں سے انھیں چھو ہی لیا ہے
آئینہ کا رُخ جب وہ ادھر کرتے رہے ہیں

گلزار میں بہتی رہیں، دولت کی بھی نہریں
شاعر ہیں کہ شبنم پہ گزر کرتے رہے ہیں

ہم لوگ نشورؔ آج ہیں سائنس کے رہبر
مدّت سے ستاروں پہ سفر کرتے رہے ہیں

۲۶/مارچ ۱۹۷۰ء

﴿۲۸۶﴾

یہ آنسو[۱] جو پلکوں پہ آئے ہوئے ہیں
ستارے یہاں سر جھکائے ہوئے ہیں

نگاہوں کا اِک نام حسنِ ادا بھی
یہ جادو بھی اپنے جگائے ہوئے ہیں

دو طرفہ قطاریں ہیں پھولوں کی لیکن
ہمیں ہیں جو دامن بچائے ہوئے ہیں

محبت کے اِک زخم کا تذکرہ کیا
زمانے کی ٹھوکر بھی کھائے ہوئے ہیں

شریکِ غم و دَرد کوئی نہیں ہے
ہم اپنا جنازہ اُٹھائے ہوئے ہیں

۱۱/اگست ۱۹۶۹ء

---

[۱] اس غزل کے چند اشعار مجموعۂ کلام ''گل افشانیٔ گفتار'' میں شامل ہیں، کچھ اشعار رہ گئے تھے وہ اس مجموعہ کی زینت ہیں۔

۲۸۷

ایک رات آتی ہے ، ایک رات جاتی ہے
گیسوؤں کے سائے میں کس کو نیند آتی ہے

سلسلہ غمِ دل کا بے سبب نظر آیا
شمع سے کوئی پوچھے کیوں لہو جلاتی ہے

حسن سے بھی کچھ بڑھ کر بے نیاز ہے یہ غم
داغ دِل محبت بھی گِن کے بھول جاتی ہے

نام پڑ گیا اس کا کوچۂ حرم لیکن
یہ گلی بھی اے زاہد ، میکدے کو جاتی ہے

چلتے چلتے نبضِ غم ، ڈوبتی ہے یوں اکثر
اِک تھکے مسافر کو جیسے نیند آتی ہے

ہاتھ رکھتی جاتی ہے یاس دِل کے داغوں پر
میں دِیا جلاتا ہوں، وہ دِیا بجھاتی ہے

مٹ گئے نشورؔ آ کر ذہن میں ہزاروں غم
شعریت کا عالم بھی رمز بے ثباتی ہے

۳؍اپریل ۱۹۶۹ء

اس غزل کے تین شعر مجموعۂ کلام ''گل افشانیٔ گفتار'' میں شامل ہیں۔

﴿۲۸۸﴾

دِل کی یہ شکستگی بہت ہے
اِک لمحہ آگہی بہت ہے

جینے کا اگر ہو کچھ سلیقہ
تھوڑی سی یہ زندگی بہت ہے

آگے نہ ابھی قدم بڑھانا
رُک جاؤ کہ روشنی بہت ہے

نازک ہو اگر دلِ محبت
اِک پھول کی پنکھڑی بہت ہے

کس کس کو کرے سلام کوئی
خالق ہی کی بندگی بہت ہے

یاد اِن کو کیا کہ آگئے یہ
ان اشکوں کی زندگی بہت ہے

ہر قطرہ کا ہے حساب دینا
ساقی کی نظر کڑی بہت ہے

تاریخ بشر کی رہبری کو
اِک کوچۂ دلبری بہت ہے

واقف ہے نگاہِ شوق سے بھی
وہ جلوہ جو اجنبی بہت ہے

اِک آہِ فسردہ ہے لبوں پر
اور وہ بھی رُکی تھمی بہت ہے

ویرانہ نہیں نشورؔ کا دِل
بستی ہے مگر لُٹی بہت ہے

۱۷ر جنوری ۱۹۶۸ء لکھنؤ۔ سراجؔ لکھنوی کی پہلی یادگار کے موقع پر

﴾۲۸۹﴿

بہار آئی مگر مُسکرا کے لَوٹ گئی
غموں کی شاخ پہ شمعیں جلا کے لوٹ گئی

سیاہ زُلف جو اُن کروٹوں میں دَب سی گئی
وہ ناگنوں کی طرح چوٹ کھا کے لوٹ گئی

صبا بھی چوُرسی ہے، رنگ و بو کی گلیوں میں
کلی تھی خواب میں، وہ گُدگُدا کے لوٹ گئی

سبھی گناہ میں آلودہ تھے تو رحمتِ عام
اَندھیری رات کا پردا گرا کے لَوٹ گئی

ترے جمال کی تابندگی کے عَالم میں
کرن جو آئی تو کچھ جگمگا کے لوٹ گئی

دبے قدم جو کسی رات تیری یاد آئی
اکیلے گھر میں دِیا سا جلا کے لوٹ گئی

بڑے بڑوں کی جو شہرت اِدھر کو آئی نشورؔ
سخن شناس سے آنکھیں چُرا کے لوٹ گئی

۲۴؍دسمبر ۱۹۶۷ء بہ فرمائش اُردو مجلس ریڈیو دہلی

ہوائے دیر و کعبہ ہے تو میخانوں میں کیوں آئے
خزاں پرور جو موسم ہے گلستانوں میں کیوں آئے

غمِ دل، ایک عنواں اختتامِ لفظ و معنی کا
حقیقت جب یہاں پہنچی تو افسانوں میں کیوں آئے

غزل آورۂ اندازِ گُلبازی سہی لیکن
یہ دوشیزہ نئی دُنیا کے نادانوں میں کیوں آئے

یہ سب ساحل پہ اپنا اپنا سودا بیچ لیتے ہیں
جو قومی رہنما کوئی ہے طوفانوں میں کیوں آئے

فرشتے درد کے رقصاں تری غمگیں نوائی پر
ترا نغمہ نشورؔ اس دور کے گانوں میں کیوں آئے

الٰہ آباد۔ ۸؍نومبر ۱۹۶۷ء

اس گلستاں میں یہی رسم چلی جاتی ہے
پنکھڑی پھولوں کی قدموں سے مِلی جاتی ہے

کبھی نکلے، کبھی ڈوبے، کبھی چھلکے آنسو
غم میں اشکوں سے یوں ہی چھیڑ چلی جاتی ہے

اُن کی مخمور نگاہوں میں ہے کیا جانئے کیا
دِل کے پیمانے میں صہبا سی ڈھلی جاتی ہے

وہ رقابت کے ہوں شعلے کہ محبت کی تپش
اپنی ہی آگ میں ہر شمع جلی جاتی ہے

زندگی کم ہے جرائم کی بہ فیضِ غمِ دوست
موت اُن کی بھی نہ سمجھو کہ ٹلی جاتی ہے

رات کے وقت غم انگیز حکایت کو نہ چھیڑ
آگ جلتی ہے تو جلتی ہی چلی جاتی ہے

دونوں جانب ہیں تکلّف کے گھروندے آباد
دُور تک عشق و محبت کی گلی جاتی ہے

انتظارِ سحرِ ناز کا عالم مت پوچھ
رات کی رات ان آنکھوں میں ڈھلی جاتی ہے

سجدہ کرنے کی جگہ کوئے ملامت ہے نشورؔ
خاک اس کوچہ کی آنکھوں سے مَلی جاتی ہے

۲۲؍اکتوبر ۱۹۶۷ء مکرانہ

﴾۲۹۲﴿

دھڑکنیں قلبِ حسیں سے لے لو
دِل کسی مَاہ جبیں سے لے لو

مرنے والوں کا بھی اِک اندازہ
ان کے اندازِ حسیں سے لے لو

گیسوؤں والے بھی دِل رکھتے ہیں
غم جو چاہو تو انھیں سے لے لو

منتشر سی ہے خرابات کی شام
رنگِ پیمانہ کہیں سے لے لو

غم سے خالی ہیں فلک کے گوشے
درد چاہو تو زمیں سے لے لو

چاندنی چوک ہو یا شامِ بہار
ہار پھولوں کے کہیں سے لے لو

کیوں بھٹکتے ہو اندھیروں میں نشورؔ
روشنی صبحِ یقیں سے لے لو

ماہ نو نئی دہلی ۸؍اگست ۱۹۶۷ء

۲۹۳

منزلِ عشق میں کچھ دَرد کے عنواں بھی مِلے
اسی کوچے میں محبت کے چراغاں بھی مِلے

رونے والوں ہی نے گل برگ سے پونچھے آنسو
شبنم اَفشاں جو ہوئے تھے وہ گل افشاں بھی مِلے

فخر کرتے تھے جو کعبہ کی نگہبانی پر
وقت آیا تو وہی دشمنِ ایماں بھی مِلے

آج پھر چپ سے ہیں آئینِ چمن بندی پر
ہم جو کل شاخِ نشیمن پہ غزل خواں بھی مِلے

دِل ہے کیا چیز، اُنھوں نے کبھی پوچھا تھا نشورؔ
آئینہ سامنے رکھا تھا تو حیراں بھی مِلے

۲۲؍جولائی ۱۹۶۷ء

چند افراد کو نفرت ہے اسی اُردو سے
گرم بازارِ قیادت ہے اسی اُردو سے

تلسیؔ و سورؔ کے نغمے ہوں کہ غالبؔ کی نوا
یہ وطن زندہ حقیقت ہے اسی اُردو سے

ہوں وہ چکبستؔ کہ اقبالؔ و نسیمؔ و مُلّاؔ
اہلِ کشمیر کی وقعت ہے اسی اُردو سے

یہ محبت کی زباں ہے کہ جواہرؔ کے نقوش
اِندراؔ کو بھی محبت ہے اسی اُردو سے

زندہ رہتے ہیں فقط زندہ زبانوں والے
زندہ اے دوست یہ ملّت ہے اسی اُردو سے

شعر کیوں کہتے ہیں شاعر یہ نہ پوچھو ہم سے
شاعروں کی یہ عنایت ہے اسی اُردو سے

۱۱؍جولائی ۱۹۶۷ء

شام بھی اپنی رقیبوں کی سحر ہوتی ہے
دِل دھڑکتا ہے تو دُنیا کو خبر ہوتی ہے

یاس و اُمّید میں کوئی بھی نہ ہارا آخر
ہے اِدھر دُھوپ تو پرچھائیں اُدھر ہوتی ہے

ایشیا میں کوئی مذہب بھی رَوَا دَار نہیں
ایک تاریخ ہے جو خون میں تر ہوتی ہے

مُردہ دِل کے لیے کلیوں کی کسک بے معنی
زندہ قوموں کو غمِ دل کی خبر ہوتی ہے

ہر ستارے پہ گمان تھا کوئی دِل ڈوب گیا
رات سے پوچھئے ! کس طرح سحر ہوتی ہے

اپنی ہی آگ میں جلتا ہے ہر ایک حُسن نشورؔ
لالہ و گل کی بھی شعلوں میں بسر ہوتی ہے

۱۲؍جون ۱۹۶۷ء

﴿۲۹۶﴾

حُسن و عشق اجتناب ہیں دونوں
اِک کھنچتی شراب ہیں دونوں

عکس اور تیرگی بھی غیر نہیں
سایۂ آفتاب ہیں دونوں

غمِ دوراں ہو یا غمِ جاناں
اپنا اپنا جواب ہیں دونوں

حُسن خود بیں و عشق خود رفتہ
جگتی آنکھوں کا خواب ہیں دونوں

ان کی محفل میں یاس یا اُمّید
اِک شکستہ رباب ہیں دونوں

یہ گنہ گار اور زاہدِ عصر
دُور تک ہم رکاب ہیں دونوں

وقت اور وقت کے جلیسِ حیات
اچھے ہیں اور خراب ہیں دونوں

موت ہو یا حیات کچھ ہو نشورؔ
محورِ اضطراب ہیں دونوں

یومِ میرؔ کے لیے (رضا ڈگری کالج، رام پور) ۸؍جنوری ۱۹۶۷ء

۲۹۷

دِل و دِلبر سہی اَب خواب سے بیدار ہیں دونوں
شریکِ محفلِ آرائشِ گفتار ہیں دونوں

عبادت خانہ ہائے کفر و ایماں میں گیا لیکن
نِدا آئی کہ واپس جا ، یہاں غدّار ہیں دونوں

یہ شیخ و برہمن جو ہوش میں تھے اب نشے میں ہیں
خُدا کا نام لے کر برسرِ پَیکار ہیں دونوں

چمن میں کیا ہوا گُلچیں ہو یا گُل کار کیا جانے
نظر آتا یہی ہے نرگسِ بیمار ہیں دونوں

درونِ حلقۂ گنگ و جمن ہے شعر کی دُنیا
یہ دِلّی ، لکھنؤ بھی کچھ نہیں، اُس پار ہیں دونوں

تغافل کی ادا ہو یا حکومت کی اداکاری
بُرا کس کو کہوں میرے لیے سرکار ہیں دونوں

جدھر دولت کی کرنیں ہیں اُدھر جاتا نہیں کوئی
وہ عاشق ہو کہ شاعر، سایۂ دیوار ہیں دونوں

نگاہِ اہلِ دُنیا ہو کہ چشمِ نیم خواب اُن کی
کبھی اقرار ہیں دونوں ، کبھی اِنکار ہیں دونوں

کوئی شاعر نشورؔ ایسا نہیں جو مجھ سے مِلتا ہو
نئے ہوں یا پرانے وقت کی تکرار ہیں دونوں

نومبر ۱۹۶۶ء ۔ صبحِ نَو پٹنہ

متفرقات

اِک روز تمھیں یوں مِرا افسانہ کہو گے
جب ہوش میں آؤ گے تو دیوانہ کہو گے

دیکھو گے اگر غور سے تہذیبِ جہاں کو
اِس دَور کو اِک دَورِ بہیمانہ کہو گے

۲؍اگست ۱۹۶۶ء

لہو دل کا یہ دُنیا مانگتی ہے
یہ مٹّی ہے جو سونا مانگتی ہے

حیاتِ غم ہو یا مرگِ مئے عیش
حقیقت کوئی پردا مانگتی ہے

جوانی شکوہ سنجِ دَردِ ہجراں
محبت شامِ تنہا مانگتی ہے

مِری تیرہ نصیبی کچھ نہ پوچھو
سحر میری اُجالا مانگتی ہے

خِرد کی ہر نظر مَائل بہ تفریح
یہ بینائی تماشا مانگتی ہے

بڑا انعام ہے اے دوست غم بھی
کسے مِلتا ہے، دُنیا مانگتی ہے

غرورِ حُسن ہو یا خونِ حسرت
وہ چشمِ مست ، صہبا مانگتی ہے

ہر اِک آغاز کا انجام دیکھا
یہ دُنیا کوئی عقبیٰ مانگتی ہے

نیا ذہن اور نئی کوشش ، نیا خون
کچھ اُردوئے معلّیٰ مانگتی ہے

نشورؔ اَب میں زبانِ اہلِ دِل ہوں
مِرے اشعار دُنیا مانگتی ہے

رانچی۔ ۲۹؍مئی ۱۹۶۶ء

(۳۰۰)

آج کے نوجوانوں سے خطاب

نظر نواز اِشاروں کا اعتبار نہ کر
چمن میں زہرہ جبینوں کا انتظار نہ کر

کلی تو خیر کلی ہے شمیمِ گُل پہ نہ جا
گزرنے والی نسیمِ سحر سے پیار نہ کر

صبا سے پوچھ لے رستہ نظر کے کوچوں کا
رَقیب کو کبھی ناداں شریکِ کار نہ کر

مشاعروں کی جو زینت ہیں ان کھلونوں کو
بتانِ انجمنِ شعر میں شمار نہ کر

جلا لے اپنے دیئے بادِ تند سے پہلے
کبھی تھمی ہوئی آندھی کا اعتبار نہ کر

جہاں نہ ہو ادب و شعر و حُسن کی محفل
وہاں نشورؔ کے نغموں کا انتظار نہ کر

۲۴/اپریل ۱۹۶۶ء (حلیم مسلم کالج کانپور میگزین)

﴿۳۰۱﴾

شکوہ کرے گلہ کرے ، عذرِ جفا کرے
کیوں خود کو انتشار میں غم مبتلا کرے

اے دوست اِک ادھوری کہانی میں لطف ہے
جب انتہا قریب ہو پھر ابتدا کرے

وہ جس کے رنگ و نور سے معمور ہے حیات
گزرے اگر چمن سے تو کارِ صبا کرے

اس دور میں شعورِ محبت ہے پائمال
عمرِ دراز بھی کوئی پائے تو کیا کرے

مجھ پر بھی کچھ خُدا کی عنایت ہو تیرے ساتھ
تجھ کو کرے جو رِند مجھے پارسَا کرے

مصروف شعر و فن کے تصرّف میں ہے نشورؔ
دُنیا یہ چاہتی ہے ترنُّم سُنا کرے

۲۰/اپریل ۱۹۶۶ء

﴿۳۰۲﴾

ہجوم اشکِ غم سہی غموں کو آفریں کہو
ستارے ٹوٹتے رہیں اُنھیں کو مہ جبیں کہو

محبت ایک ابتدا ہے جس قدر حسیں کہو
ہزار بار دیکھ کر نگاہِ اوّلیں کہو

ہزار گُل کھلا دیئے ہیں جادوئے نگاہ نے
طلسم جلوہ کچھ نہیں نظر کو آفریں کہو

سِتم کا حوصلہ ہو تو سَلیقہ پہلے سیکھ لو
جراحتوں کو گل کہو لہو کو آستیں کہو

گلوں کو چُپ سی لگ گئی کلی کا منہ بھی بند ہے
چمن اگر ہوا نہ دے چمن کو نکتہ چیں کہو

وہ موت سے ڈرا نہیں جسے یقیں تھا غیب پر
دِلوں کے انتشار کو حیاتِ بے یقیں کہو

چمن کا راز بھی کہو زبانِ عَندلیبؔ میں
ہمیشہ چُپ کی دَاد کیا جو بات ہو وہیں کہو

کلام اور کلیم میں بھی فرق ہے نگاہ کا
ادائے دِل نشیں کو کیوں کلامِ دلنشیں کہو

سمجھ سکو تو زندگی سَفر کا اختتام ہے
یہاں کوئی قدم اُٹھے تو گامِ واپسیں کہو

نشورؔ لکھنؤ میں ہے ادا عروسِ شعر کی
جہاں حِنا کا رنگ ہو غزل وہیں حسیں کہو

مشاعرہ ریڈیو لکھنؤ ۱۳؍مارچ ۱۹۶۶ء

﴿۳۰۳﴾

حُسن شعلہ ہے ہستی کے دَامن تلے
خود جَلے ، جو قریب آئے وہ بھی جَلے

روئے تاباں سے زُلفیں حَسیں تر ہوئیں
چاند جتنا چڑھے رات اتنی ڈھلے

اِن اداؤں میں کچھ نرمیاں آ گئیں
جیسے سونا پگھل جائے چاندی گلے

ان سے بچ کر گزرتا رہا عُمرُ بھر
غم کی راہوں میں آتے رہے زلزلے

چپکے چپکے غمِ دِل سے پھوٹے کرن
دھیمے دھیمے چراغِ محبت جَلے

موت آئے تو اس کی خبر بھی نہ ہو
زندگی وہ ہے جو جان لے کر ٹلے

کوئی جلوہ ہو شعلہ ہو یا ساز ہو
کام ٹھنڈے لہو سے کہاں تک چلے

دِل جہاں تھا وہیں دِل کا حاصلِ مِلا
کھو گئے فَاصلے ، سوگئے مَرحلے

نفرتوں کی ہوائیں تو دھیمی پڑیں
اِک چراغِ محبت کہاں تک جَلے

کیوں نہ آغوش میں لے اسے گلستاں
پا برہنہ جو کانٹوں پہ شبنم چَلے

کس کو دیکھا کہ اَپنا یہ عالَم ہوا
چُھٹ گئے زندگی کے حسیں مشغلے

حوصلہ کام آتا ہے لیکن نشورؔ
شاعری چاہتی ہے نئے وَلوَلے

جموں ریڈیو کے لیے۔ ۱۰؍فروری ۱۹۶۶ء

﴿۳۰۴﴾

جاگ اے حیات جاگ، ابھی آدھی رات ہے
اے عشق کا سُہاگ، ابھی آدھی رات ہے

شیشے کی جو پری ہے وہ عریاں ہے بزم میں
اُڑنے لگے ہیں کاگ، ابھی آدھی رات ہے

اے عطرِ زندگی، تری انگڑائیاں دراز
اے شام کے سُہاگ، ابھی آدھی رات ہے

جینا ہے صبح تک، تو نہ سانپوں سے کھیلنا
زُلفیں ہیں کالے ناگ، ابھی آدھی رات ہے

توبہ قبول ہوتی ہے، کچھ اپنے وقت پر
بے وقت کا ہے تیاگ، ابھی آدھی رات ہے

ہے شام اور یہ نیند ، یہ رُوٹھی ہوئی اَدَا
اے دوست جاگ جاگ، ابھی آدھی رات ہے

سردی و تشنگی میں فسرہ ہے زندگی
ساقی اُٹھا لے آگ ، ابھی آدھی رات ہے

شاعر کو پوچھتا نہیں، یاں صبح کو کوئی
دہلی سے تو بھی بھاگ، ابھی آدھی رات ہے

اب بھی نشور سینے میں بجتا ہے اِک سِتار
اُٹھ اے حَسین راگ، ابھی آدھی رات ہے

۲۶/جنوری ۱۹۶۶ء لال قلعہ دہلی

۳۰۵

زِندگی میں عشق پر الزام پہلے آ گیا
بات جب نکلی جنوں کا نام پہلے آ گیا

موت ہو یا زیست ہو اقدام ہے وجہِ کمال
جیت اس کی ہے جو دو اِک گام پہلے آ گیا

کوئی طائر جانبِ گلشن نہ آیا تھا مگر
کنج میں صیّاد لے کر دام پہلے آ گیا

ہے نشور اِک تیرہ روزی کا تسلّط آج کل
صبح کیا جانے کہ وقتِ شام پہلے آ گیا

۲۰ جنوری ۱۹۶۶ء

﴿۳۰۶﴾

غم جواں ہوا مگر کیفِ زندگی نہیں
سب چراغ جل اُٹھے پھر بھی روشنی نہیں

اس سے کچھ نہ پوچھئے جو کلی کِھلی نہیں
غنچگانِ راہ سے چھیڑ یہ نئی نہیں

اُن کے اِلتفات میں رُوٹھنے کی ہے اَدا
بات کچھ ضرور ہے کوئی بات بھی نہیں

یوں تو بارہا ملی ، صبحِ زندگی مگر
پہلی پہلی اِک کرن مجھ کو بھولتی نہیں

میکدے کے اِرد گرد آخری کرن سی ہے
دوستو! رُکو ذرا شام ابھی گھنی نہیں

ہر سحر کے موڑ پر چونکتا ہے خواب سے
عِشق کے شہید کی نیند آخری نہیں

جو رفیقِ راہ تھے سب چلے گئے نشورؔ
آج بزمِ اُنس میں لُطفِ شاعری نہیں

۱۰؍جنوری ۱۹۶۶ء شاستری جی کی اچانک تاشقند میں موت ہو جانے پر

﴿۳۰۷﴾

غم جوان و حَسیں، رات کیسے کٹے
ہم کہیں وہ کہیں رات کیسے کٹے

کوئی دھوکا سہی، کوئی وعدہ سہی
بے گماں و یقیں، رات کیسے کٹے

پھر کسی نے پکارا کہیں دُور سے
ہر صَدا دِل نشیں، رات کیسے کٹے

آؤ چَل کر ذرا یہ گلی دیکھ لیں
میکدہ ہے کہیں، رات کیسے کٹے

خواب میں اُن کا مِلنا ہے ممکن مگر
نیند اپنی نہیں رات کیسے کٹے

کب تلک یہ نشورؔ، اشک کا سلسلہ
تر ہوئی آستیں، رات کیسے کٹے

۱۴؍دسمبر ۱۹۶۵ء

﴿۳۰۸﴾

خاک اپنی غبار ہوگئی ہے
بجلی تھی شرار ہوگئی ہے

کیا لکھوں کہ چشمِ تر ہی میری
افسانہ نگار ہوگئی ہے

اِس رُخ سے ہر اِک نظر پلٹ کر
تنقیدِ بہار ہوگئی ہے

تھی پھول کی اِک کلی محبت
کانٹوں میں شُمار ہوگئی ہے

اِس دَور کی زندگی نہ پوچھو
تلوار کی دَھار ہوگئی ہے

ساحل پہ ہے رہزنوں کا خطرہ
کشتی ہے کہ پار ہوگئی ہے

خوشیوں کی برات چلتے چلتے
اشکوں کی قطار ہوگئی ہے

بدلی ہوئی اس نظر کو دیکھا
بے قول و قرار ہوگئی ہے

سب نقد خرید تے ہیں دوزخ
جنت جو اُدھار ہوگئی ہے

شیشے کی پری نشورؔ توبہ
دِل لے کر فرار ہوگئی ہے

ماہنامہ دَورِ حیات ممبئی۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۶۵ء

﴿۳۰۹﴾

جہانِ نوَ میں بھی اہلِ ستم نہیں بدلے
خدا بدل گئے، لیکن صنم نہیں بدلے

فریب میکدۂ نوَ بھی سب نے دیکھ لیا
سفال ٹوٹ گئے جامِ جم نہیں بدلے

جو لوگ اگلے زمانے کی لاج رکھتے ہیں
وہ اس پہ خوش ہیں کہ ہم، کم سے کم نہیں بدلے

مِرا سلام کہو جا کے بزمِ زاہد میں
جہاں بدل گئے پر، محترم نہیں بدلے

کوئی ہو قافلہ راہِ جنوں وہی ہے نشورؔ
قدم بدل گئے، نقشِ قدم نہیں بدلے

مشاعرہ جشن جمہوریت لال قلعہ دہلی۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۶۵ء

۳۱۰

وہ بہکے ہوئے ہیں نہ تو ہم بہکے ہوئے ہیں
تھوڑا سا محبت کے قدم بہکے ہوئے ہیں

پلکوں نے لیے دامن رنگیں کے کنارے
آنسو ترے اَے دیدۂ نم بہکے ہوئے ہیں

وہ حُسن کے مالک ہیں جسے چاہیں نوازیں
اچھے ہیں پر اندازِ کرم بہکے ہوئے ہیں

اب دیکھئے کیا گردشِ افلاک دکھائے
پھر چاند ستاروں کے قدم بہکے ہوئے ہیں

دُنیا کی ادا اور ہے اور اپنی ادا اور
سب مصلحت اندیش ہیں ہم بہکے ہوئے ہیں

میخانے میں اعزاز ملا بے خبروں کو
کم قدر ہیں وہ لوگ جو کم بہکے ہوئے ہیں

ہے نام نشورؔ، آج کی سرخی میں نُمایاں
پھر نامہ نگاروں کے قلم بہکے ہوئے ہیں

۲۱؍اپریل ۱۹۶۴ء لکھنؤ

﴿۳۱۱﴾

شیشوں میں شرابِ سحر و شام پڑی ہے
اے ساقیٔ میخانہ، تری بات بڑی ہے

یہ شام بھی تاریخِ شبِ غم کی کڑی ہے
ہر ایک ستارے سے یہاں آنکھ لڑی ہے

ہر لحظہ یہاں ٹلتے ہیں اعمالِ خلائق
ہر لمحہ یہاں جیسے قیامت کی گھڑی ہے

سَو دَورِ خزاں دیکھ کے پھولی ہے ہر اِک شاخ
غنچوں کی یہاں عُمر بہاروں سے بڑی ہے

یہ خاکِ کفِ پا ہے مِٹائے نہ مٹے گی
تو کس لیے اے گردشِ تقدیر اَڑی ہے

اے گوشہ نشینانِ زیارت گہِ تہذیب
نکلو، کہ یہاں فصلِ جنوں اب بھی کھڑی ہے

ممکن ہے کہ یہ تیر نشانے پہ نہ پہنچے
بازو میں سکت کم ہے کماں اپنی کڑی ہے

گل اپنے تبسّم میں مگن ہیں تو کہوں کیا
غنچوں کو کہاں یاد کہ اُس لب پہ دھڑی ہے

شاعر ہے نشورؔ آج زمانے کا پیمبر
خاموش کہ اس دَور میں یہ بات بڑی ہے

۲۶؍جنوری ۱۹۶۴ء نیا دور لکھنؤ

اس غزل کے تین شعر گل افشانیِ گفتار میں شامل ہیں

۳۱۲

خاموش ہیں لب پر اشکوں کی تحریر کہاں لے جائے کوئی
کم کم ہی سہی احساسِ الم تاثیر کہاں لے جائے کوئی

اس باغ کے رنج و راحت کی تعمیر کہاں لے جائے کوئی
وہ پھول چُنیں، ہم کانٹے لیں، تقدیر کہاں لے جائے کوئی

آزاد چمن، برباد وطن، سب کے لیے ہے اِک قید ستم
دُنیا سے تعلّق سب کو ہے زنجیر کہاں لے جائے کوئی

اپنی ہی خطا کا دُنیا میں انسان نشانہ بنتا ہے
اپنی[۱] ہی کماں، اپنا ہی جگر، یہ تیر کہاں لے جائے کوئی

---

۱ بیاض میں یہ مصرع اس طرح بھی لکھا ہے۔
''اپنی ہی کماں سے چھوٹا ہے یہ تیر کہاں لے جائے کوئی''

مایوس ہے دل لیکن اے غم، ہے یاد تو اس کی اپنی جگہ
آئینہ تو اس نے توڑ دیا، تصویر کہاں لے جائے کوئی

ملبوس حریری سے اُن کے رنگین کرن چھنتی ہی رہی
وہ چاند چھپا لیں دامن میں، تنویر کہاں لے جائے کوئی

شاعر کے لیے یہ جنبشِ لب، عنواں ہے نشورؔ اِک عظمت کا
خاموش لگن خدمت کی سہی، تقریر کہاں لے جائے کوئی

مشاعرہ بھوپال۔۲ جنوری ۱۹۶۴ء

اہلِ دانش روشِ عام سے آگے نہ گئے
اِنتظارِ سحر و شام سے آگے نہ گئے

عہدِ حاضر کے جواں تیز نظر تھے لیکن!
جلوہ گاہِ رَم و آرام سے آگے نہ گئے

قافلے علم و عمل کے بھی شتاباں تھے مگر
وہ بھی اِک کوششِ ناکام سے آگے نہ گئے

بت کدۂ حُسنِ خیالات کے تھے رہزنِ ہوش
اہلِ دیں کو چۂ اَصنام سے آگے نہ گئے

منزل آگاہ نشورؔ اہلِ سخن تھے لیکن!
وہ بھی شورِ دِلِ ناکام سے آگے نہ گئے

۶/جون ۱۹۵۸ء

اس مقتلِ وفا کی حدوں میں جو آ گئے
دیکھا یہی کہ اُن کے قدم ڈگمگا گئے

اہلِ خِرَد کا کام ہے تفریق کارواں
اِنسانیت کی راہ میں دیوار اُٹھا گئے

ساقی تری نگاہ کا شاید قصور ہو
یہ کیا ہوا کہ ہوش میں دیوانے آ گئے

اب تک ہے بزمِ غیر میں بھی جس کی روشنی
کچھ لوگ تھے جو شمعِ محبت جلا گئے

جاتے نہیں نشورؔ کسی بزمِ ناز میں
اہلِ وفا کا نام سُنا تھا تو آ گئے

طرحی مشاعرہ ادب عالیہ کانپور۔ ۱۶/نومبر ۱۹۴۲ء

شب تیرہ ہے تو آنسو پس تیرگی بہا لوں
مجھے اتنی ہو اجازت کہ چراغ ہی جلا لوں

مرا غم خوشی ہے میری یہی زندگی ہے میری
مری روٹھی روٹھی دنیا اسے چاہے جب منا لوں

وہ چلیں تو گرد رہ میں نظر آئیں ماہ و انجم
وہ ملیں تو زندگی کو ابھی چاندنی بنا لوں

کوئی آستانہ ہے یہ غم و عشق و آگہی کا
جو کہیں نہیں جھکا تھا وہی سر یہاں جھکا لوں

مری بے خودی نظر میں مرے راستے سفر میں
جو سرک رہی ہو منزل تو قدم کہاں سنبھالوں

مجھے کچھ نہیں ملا ہے تو نشورؔ فکر کیا ہے
جو نہیں کوئی سہارا تو غزل ہی گنگنا لوں

ستمبر ۱۹۷۱ء (غیر مطبوعہ)

روشنی کو بھی اندھیروں سے نکلتے نہ بنے
تیز جلتے ہوئے دیپک سے بھی جلتے نہ بنے

پھول بھی توڑ چکے روند چکے کلیوں کو
آنے والی نئی صبحوں کو کچلتے نہ بنے

جس طرف دیکھیے کانٹوں کی بچھی ہے چادر
صحن گلشن میں ہواؤں سے بھی چلتے نہ بنے

کیسی بستی ہے اندھیروں کی کہ اب محفل میں
عشق میں کوئے ملامت سے نکلتے نہ بنے

وقت سے پہلے بدل جاؤ تو اچھا ہے نشورؔ
غم کے طوفانوں میں انساں سے سنبھلتے نہ بنے

۳؍مئی ۱۹۷۳ء لکھنؤ (غیر مطبوعہ)

۱۹۶۹ء

بسلسلۂ جشنِ غالبؔ

ایک غزل بہ زبان فارسی

﴿۳۱۹﴾

(حیات و کائنات غالبؔ کی نگاہ میں)

غالبؔ نکتہ سرا راز معانی دانست
جُز بہ ادراک فناء ایں ہمہ خانی دانست

مستی بادۂ او ہست شکست جم و جام
نشہ را از ہمہ اسباب گرانی دانست

صورتے نیست بجز پردۂ تصویر فریب
نقش را گمرہی صفتِ مانی دانست

لفظ را ہیچ وجودے نہ بود در عالم
از عدم صورت ترکیب معانی دانست

انچہ دانیم نہ دانیم بجز نقش خیال
زیست را خواب جُنوں ہمہ دانی، دانست

عقل شیدا است بہ صورت گری موج وحباب
عشق بے آبی و بے بحر روانی دانست

کُن فکاں صورتِ اعدام منقش دارد
از عدم ایں ہمہ تعمیر میانی دانست

عندلیب است خلل زادۂ ایجاد بہار
عشق را خندۂ گلہائے جوانی دانست

نیست راہے بہ نہاں خانۂ غالب نہ درے
از نشورؔ ایں ہمہ اسرار توانی دانست

بسلسلۂ جشن غالبؔ ۱۹۶۹ء (مجموعہ عزمِ محکم)

متفرق اشعار

مجموعۂ کلام صہبائے ہند

مجموعۂ کلام شورِ نشور

مجموعۂ کلام گل افشانیِ گفتار

مجموعۂ کلام صہبائے ہند

حسن کی یاد اگر حد سے گذر جائے گی
وہ ہی وہ ہوں گے جہاں تک بھی نظر جائے گی

....

یاد وہ شے ہے کہ جب یاد مری آئے گی
آپ فریاد کریں گے دلِ مضطر تھامے

....

تاثیر دیکھیے گا ان کے غمِ نہاں کی
غمگیں بنا رہی ہیں دلچسپیاں جہاں کی

....

اے وہ، کہ تو پنہاں ہے ہر دل کی تباہی میں
کیا قہر کیا تو نے، بالوں کی سیاہی میں

....

نظر بازیاں ہیں ہوسناکیاں ہیں
جوانی کی دل چسپ بے باکیاں ہیں

....

غضب کی ہے نشورؔ دلستانیاں لیے ہوئے
خرامِ نازِ حسن کا جوانیاں لیے ہوئے

....

طے صدمۂ فراق کے سب مرحلے ہوئے
مدّت کے بعد مل گئے جب دو جلے ہوئے

....

بہار لوٹ لوں دو دن تو زندگانی کی
کہ پھر نہ میں ہوں نہ یہ حسرتیں جوانی کی

....

وہ چڑھالیں بھویں یا جھکالیں نظر
ان کو حاجت نہیں کوئی تلوار کی

....

آپ دامن بچا کر نکل جائیں گے
کیا اصولِ محبت بدل جائیں گے

....

سیکڑوں کوس گیا قافلۂ عشق نکل
ہم جو دَم لینے کو سائے میں ذرا بیٹھ گئے

....

آپ کو دیکھ لیا آپ کو پھر دیکھوں گا
بس مری زندگی و موت کا حاصل ہے یہی

....

شعلہ دلِ مضطر کا کیا عرض کروں کیا ہے
سیماب کے کوزے میں اِک آگ کا دریا ہے

....

جلوے کا سمجھ لیجیے معیار وہاں کیا ہے
جب طور کا جلوا بھی جلوا نہیں پردا ہے

....

محبت دی ہے جس نے اوّل عہدِ جوانی میں
بھلایا جا نہیں سکتا وہ مرگ و زندگانی میں

....

کہیں شکلِ مسرّت ہے کہیں کچھ صورتِ غم ہے
مگر دُنیائے اُلفت میں مری ماتم ہی ماتم ہے

....

جگایا تھا مجھے صبحِ ازل صوتِ الستی نے
مگر اِک نیند میں پھر سو رہا لفظِ بلیٰ کہہ کر

....

مرا شیوہ ہے بے پروائے ہستی ہر نفس رہنا
میں فکرِ عیشِ امروزہ غمِ فردا سمجھتا ہوں

....

قیامت کی دَرازی میری راتوں میں سہی لیکن
ترے ہوتے ہوئے کیا صبح ہوتے دیر لگتی ہے

....

میری اور اس کی محبت کا بھی کیا انداز ہے
میں سراپا خامشی ہوں وہ سراپا راز ہے

....

کہہ رہی ہے ہر ادائے بے نیازی آپ کی
جس میں جتنا حسن ہے اتنا ہی اس کو ناز ہے

....

راز کی بات کبھی منھ سے نکل جاتی ہے
مے ہے جب جوش میں آتی ہے اُبل جاتی ہے

....

ہم نشیں کیفیتِ مے سے ہمیں خالی نہ جان
مست ہم بھی ہیں مگر کھل کھیلنے والے نہیں

....

آج کی بے صبریاں اے رحمت ساقی معاف
تشنگی بے انتہا لبریز ساغر ہاتھ میں

....

بندگی مجھ کو ملی پستی میں مَیں ڈالا گیا
میں نہیں سمجھا کہ میں مجبور یا مسرور ہوں

....

اُن کی محفل میں نہیں میں اپنے ویرانوں میں ہوں
ناز برداروں میں کب ہوں میں تو دیوانوں میں ہوں

....

کامیابی عشق کی دیکھی کہ آخر ایک دن
مرگیا میں اور ابھی شامِ وصال آئی نہ تھی

....

ابر چھایا پھر وہ عہدِ جام و مینا آگیا
تم نہ آئے اور ساون کا مہینہ آگیا

....

مطلب ہی محبت کا ہر ایک جدا سمجھا
میں مہر و وفا سمجھا وہ جور و جفا سمجھا

....

اسرارِ محبت بھی بالائے تعقّل ہیں
میں ان کا تصوّر ہوں ہو میرے تخیّل ہیں

....

بھول جاتا ہے آدمی گویا
گردشِ روزگار میں سب کچھ

....

سکھا دو شانۂ سرکش کو طرزِ آرائش
کہ پارہ بارۂ دل بھی شکن شکن میں رہے

....

چاہے کوثر کی ہو یا مے خانے کی
ہم کو دو جرعے سے اپنے کام ہے

....

گو مے میں فنا ہوکر پیمانہ نشیں ہوں میں
تلچھٹ ہی تو ہوں آخر پھر جزوِ زمیں ہوں میں

....

وہ ترا پیمانہ جس میں پرتوِ ساقی نہیں
کچھ سہی اس میں مگر کیفیت باقی نہیں

....

نظر اُٹھائے جا بیخود بنائے جا ساقی
نظامِ عالمِ ایجاد کس کو کہتے ہیں

....

اللہ رے انفعال کہ بخشش کے بعد بھی
جاتے ہوئے بہشت میں شرما رہا ہوں میں

....

حزن ہو یا نشاط ہو رندِ خراب حال نے
ہنس کے اسے اڑا دیا ، روکے اسے مٹا دیا

....

عقل و خبر رہی نہ وہ رمز و اشارہ رہ گیا
اِک نظر سے حشر تک محوِ نظارہ رہ گیا

....

وہ ان کی بیش نازی وہ ان کی کم نگاہی
میں بھی سمجھ رہا ہوں ان کو غرور ہوگا

....

ہے رونقِ گلزار جہاں میرے ہی دم سے
میں زمزمہ ساز چمنستانِ بقا ہوں

....

چشمِ عبرت نے کیا مجھ پہ جہاں تنگ نشورؔ
آنکھ والوں کے لیے ایک عذاب آنکھیں ہیں

....

فرشتہ موت یار غمگیں عجیب عالم ہے نزع کا بھی
کوئی ہے تھامے ہوئے گریباں کسی نے دامن پکڑ لیا ہے

....

جوابِ طور ہوجانے کے ہم قائل نہیں زاہد
جو بیمارِ محبت ہے وہی انسان کا دل ہے

....

دہر کی رعنائیاں خلد بریں کی لذّتیں
ہیچ ہیں سب میرے کیفِ بےخودی کے سامنے

....

چاندنی اور چاندنی میں اِک سراپائے جمال
ہجر کی تاریکیاں اور ایک بیمارِ خیال

....

چاندنی رات ہے ساقی ہے لبِ جو بھی ہے
دوش پر کوئی بکھیرے ہوئے گیسو بھی ہے

....

حسن کا جلوہ مسلماں بھی ہے ہندو بھی ہے
نگہِ ناز میں اعجاز بھی جادو بھی ہے

....

ختم ہیں مجھ پہ نعمتیں سلسلہ مجاز کی
ہائے کمی کہ وہ کمی ہے کسی دِل نواز کی

....

عہدِ شباب و بانگِ نے ساحلِ آب و دَور مے
اب تو وہ صحبتیں نشورؔ خواب و خیال ہوگئیں

....

اُٹھا لو شیشۂ و پیمانہ بزمِ دَور سے آج
کہ پی گیا ہوں حریفوں کی اَور اَور سے آج

....

رہِ منصور سے بھی ہے مری راہِ فنا مشکل
یہاں تو کفر ہوجاتا ہے اِنّی عَبدُہٗ کہنا

....

گلِ دو شینہ تو پژمردگی میں یاد کرتا جا
چمن میں غنچۂ نشگفتہ کا نذرِ خزاں ہونا

....

مجموعۂ کلام شورِ نشؔور

میں رنگ جاں و دل بھی آب و گل میں بھرتا جاتا ہوں
نئی تشکیل عالم کا میں ساماں کرتا جاتا ہوں

....

مجموعۂ کلام گل افشانیِ گفتار

صدہا گلستاں ان کی نظر میں
یاں ایک دامن وہ بھی تہی ہے

....

محبت ساتھ چلتی ہے تو راہیں جگمگاتی ہیں
قدم رکھتا ہوں مَیں دیپک جلاتے جا رہے ہیں وہ

....

ختم شد

ISBN 81-9312467-7

9 788193 124673 >

₹ 500/-

ADABI DAIRA, AZAMGARH

email : azami408@gmail.com
Website : www.drmiazmi.webs.com
Mob.: 9838573645